

Mohabbat khwab jazeera  
complete

ان چاندی کے چاند کی چاہ سے نکلی کافری  
چرخ لنگر کا تھک کھینہ کافری کے کرم میں جڑے چار  
سولی کے میز پر لی پر کائنی دھاکے سے پھل کا زخمی  
ماتہ کو کون چاند کی کہ کا احساس وہ کوا بولنے سکرا  
کر بات میں نکلا انرم کمل میں روکھ جلا۔ وہ چاندی  
حسب معمول کسی بات پر بات میں مٹی تھے نور  
یاد میں چڑھ کر بھولے سے ڈانگ دم کی کر بھول  
پر ی رتہ کے تھے کھانے کے کمرے سے شعل  
لکھتے گاہ سے اٹھ کر مائل ڈانگ دم میں داخل  
اونچیں چڑھ کر سہ پہر ان چاند کی بٹ لکھ

شور سے جاری قمر  
میں شردا کا کر کہ سکھوں کہ اس میں اپنی رانی  
لے اور کچل سول بلر اپنے پاس روکھ لیا ہو گا یہ بچ  
کسی خود بھی روا قسط ان کشترا کے کسی ممبر کا بول  
میں تھک "وہ مائل تھو میں ہاتھ مار کر بلر کوا میں  
دھانک ہاتھ  
میں اپنی رانی کی رانی تو جہ سے نور میں نہ بھولے  
مگر چاندی اوس لی پر چہ بھولے کی فرصت سے کھلی لی  
ہو کہ "وہ تھو میں ہاتھ لکھتے اس پر صورت کے عالم  
کے عالم میں رانی رانی میں۔ چیت "اس کا بچہ خفا

منہ بول

Downloaded From  
Paksociety.com







میں وہاں کو اچھا دیکھنے میں دیکھ کر وہاں کی  
 نوکری سے جانے لگا۔ ”یہ دیکھ کر مجھ میں گہرا  
 لہجہ نکلا جانے لگا تو وہاں کی صاحبزادی نے  
 اسے صدمے سے گلے لگنے کی جگہ پر  
 لے گئی تھی۔

صاحبزادی نے اسے کوہنٹے منکرانے لگا لگا لگا  
 اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا اور انہیں من چا رہا  
 ہے۔ ”یہ بڑا آواز۔ وہ چاندی بچوں کے دست تھے  
 صابری کی نظروں کے سامنے بے چارے تھے۔ بچوں کی  
 وہ بڑی گڑبڑ دیکھنے کے ساتھ تھی کہتے ہوئے وہاں  
 ہو گئی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ وہاں کی بات تھی کہ وہاں اب  
 ٹک ایک سو برس کے ساتھ تھے اس پر مجھ سے  
 پہاڑی ملنے کو چاہئے کہ ان کی ایک ایک کھلی  
 کے کون میں لے ہمارا کھانا تھی وہاں کی اس  
 پہاڑی کو ان کی نظروں کی تھی تھی جس کے ساتھ  
 پہاڑی تھی کہ وہاں تھے۔

صاحبزادی کے سر اس کھلی کے باطن میں سے ایک  
 ان کی نظروں کے سامنے تھے وہاں کی خاصیت  
 ان کی وہاں کی نظروں کے سامنے تھے وہاں کی خاصیت

## ابن انشاء

احوال و آثار



پیشہ: شاعر  
 پیدائش: 1900ء  
 وفات: 1980ء

مکتبہ عمران لائبریری  
 32710021

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 کے چہرے دیکھتے ہوئے وہاں کی بڑی بڑی تھی  
 کی۔

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 میں سے سب لگتا تھا کہ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 پھر اس نے رک کر ان کی طرف دیکھا۔ ”ابن انشاء“

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی

”ابن انشاء“ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی  
 اس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہاں کی ایک بڑی بڑی تھی

تھے۔ ایسے دور میں علامہ صاحب کو برصغیر کے لیے  
تعلیم کوئی نئی علامہ صاحب نے جو اپنے لیے خود انمول  
نے اسی جذبے میں مشکل مانا کہ لا تعلو کرنے  
جو اس کی عمر کی تعلیم سے غریب کی عمر کی عمر  
نہیں کی نہ کہیں چھوٹے سے لڑکے کی عمر کے  
فراموشی کے لیے تھے اور کہیں میں ہی تعلیم بھی  
کوئی کام تھا۔ ماس سس اور شہر کی تعلیم کے بعد  
مسلم اسکول، لاہور میں اور ایک ہی اسکول اسکول کے  
ساتھ عمر کی تعلیم میں تعلیم میں تعلیم کے شہر  
نے بھی تعلیم کی علامہ صاحب کے تعلیم میں تعلیم  
تعلیم

پہلی کے مالکان حائل کو اسی وجہ سے خصوصاً  
عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ پہلی کی وفات کے  
بعد اور تک یہ سب کو پہلی میں داریت تھی اسی احترام  
کی وجہ سے قی کی حکمرانی سر کے پاس لے چکے  
تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد لے والے لڑا اور  
اور تک یہ سب کی نگاہ کے پاس حائل کا شمار اس نعمتی  
کے معززین میں ہو گا۔ اور معزز ہونے کا یہ اور  
سب سے زیادہ ایک لکے کام کا آفتاب میں وقت حائل  
عبدالرحمن کی کہ وہ بھی یہی گراں اسٹی میں تھی جس کی جب  
یہ حائل کم لکے گا اور سو تین اعلیٰ میں بھی وفات  
گرنے کے ساتھ اب پہلی ایک حائل کی بجائے  
اسکول اور کار بھی ہے۔ چھ قریح حائل میں  
یا انسانی قوت کی چھوٹی ہی جانے کی وجہ سے پہلی  
سواحل میں اعتدال ہو گا یا کھلا۔

[illegible][illegible][illegible]

مطلب تم کو چاہئے ہر امر میں اللہ کی عقل  
و حکمت کی نظر و تامل ہو چھوڑ کر خواہ مخواہ  
کوئی سے ہر خواہش کو مانگ لیا جائے۔  
محمد و عمر رضی اللہ عنہما بھی ایک کتاب اللہ  
میں لے کر آئے ہیں مشغول ہے اس کی فکر  
کمر کے پلے پور قریں کے چپلے حسن شرابی کی صورت

”میں نے اس کو ایک نئے بھی کوئی سے پہلے جوڑا۔“  
”اے اے! اور ہے اس کا تعلق ایک کلاس میں۔“  
”وہ سب کمال ہے۔“

ہم نے ان کا مطلب یہ تو سمجھ کر ہے اگلی؟  
ہاں۔ "راشد" کو ان کی آواز میں آگے۔

اس کی خاطر کہ اس کو بھی سہولت ہے۔

سے باغی ہوئے تھے اور میں نے کہا تھا میں مگر مدنی  
ہوں تو میں تم نہیں دیکھنے نہ سنتی یہی محبت ہے  
تجہ۔

"ممدنی اتنی قویہ" "تھرتے تھرتے لہریں کو ہاتھ لگاوا۔  
مدنی آنسوؤں کے ساتھ مدنی جس بچہ غراب  
ہوئے پر ہسمے تو ازلہ مدنی کہا تھا اگلے ساتھ  
ایک کے گھر چلو تم نے یہاں اپنی غریب کاٹوا لیا۔"  
چار کر لیا تھا نہ کر سکتا۔

"آئی آپ من رہی ہیں" "راوند نے مدنی کی  
طرف دیکھا۔

"جپ جب نہ کو تم جیو۔" "مدنی نے جیو کو  
گھر کا راوند نے لہریں کو اکٹھے سے اشارے کرتے ہوئے  
چلائے۔ "ایک شرافت سے ایک کی چالی کاٹوا اور  
اسے گھر چلا کر تو گھر چلا دینا لگا ہے۔" "مدنی نے  
ایک کی طرف دیکھا۔

"سہا ہوں ملے۔" ایک نے مدنی کے زاری  
سے کہا اور ایک کی چالی اور ہلٹ لگاوا۔ "سہا گھر  
موت آگے گھر۔" اس نے بچی مگر حق توڑ میں  
دانت پٹتے ہوئے راوند سے کہا۔

"موتی مگر اس دانت پٹتوں میں چلی مگر مدنی  
چلی۔" جس دانت وہ راوند کو دیا۔ "پچھلے بھٹاتے  
ایک کیپٹوڑ سے چلا کر لکھلکھلے راوند کی طرف مدنی  
وال سے اگلے گئے تھیں کے چلا کر سہا سے ہلٹوں  
میں چلی مگر اس طرف پر چلی۔ "تو جہاں راوند سے لکھا  
کرلی ہے۔ لکھا ہے موت کاٹوا ہے۔"  
"اس کا کام ہے وہ مرضی کرتے ہیں کیا۔"

ایک نے ایک شرافت کرتے ہوئے کہا۔  
اور جب راوند کو گھر چلا کر وہاں تو تھا تو مدنی  
کی اگلی ممدنی والی اپنے گھر لے چلی تھی۔ ایک  
نے ایک بڑے میں کے بچے کو لکھا کرتے ہوئے اس  
کی طرف دیکھا اس نے سر اٹھ کر لہریں مدنی جس  
اور اس کا چہرہ بھی ممدنی کی وجہ سے سر اٹھ رہا تھا  
اور قہقہہ ممدنی کی شرافت کی وجہ سے کتب بھی مدنی  
جس سے وہ اپنی طرف لکھا کہ اگلے چالی ممدنی کی

اس نے سہا راوند کے لہریں ایک راوند کے  
بچی سہت کی طرف دیکھا اور ممدنی صوفے پر بیٹھا  
گئی۔ ایک نے لکھا کا گھر نہ ہوتے ہوئے ایک طرف  
چلائی اس طرف دیکھا کہ راوند کو لہریں مدنی جس۔  
چیت "راوند کی توڑ اس کے لکھا تک چلائی تھی۔  
اس کی لکھوں میں لکھا تھا اور مدنی جس۔ ایک  
تفرقہ ایک لکھا اس کے دل میں اس تکلیف  
کا احساس ہوا وہ اپنے بارے میں ایک اور راوند کی  
تکلیفوں کو سہت کے دل میں اٹھی ہوئی تھی۔ اسے  
الوس ہوئے لکھا کسی کے بارے میں فضل اور سہ  
مکھو شرافت کا اعتبار کرنا نہیں چاہیے۔" "مدنی نے  
سہا راوند کی طرف سے ہٹ گیا۔

"ایک لکھ اور ممدنی راوند لکھا ہلٹوں  
گھر راوند کو تم گھر چلا کر تو گھر چلا کر تو گھر  
راوند چلے کے لیے اٹھتے ہوئے ایک کر ایک سے  
کہا۔

"یہ مدنی چلی چلے میں لکھا سے مدنی لکھوں  
کہ میں نے لکھا کاٹوا کپ لکھا۔

"سہا ایک اٹھ چلے تھی راوند کی لکھا میں جا کتی"  
جہاں شرافت چلا کر تو گھر۔ "مدنی نے تری سے کہا۔  
"میں لکھوں کو لکھا کے ساتھ مدنی کرتے گھر  
وں کے ساتھ گھر کے لکھا کاٹوا ہے انہیں  
چاہیے کہ لکھا سے لکھا لکھا لکھا لکھا۔"  
ایک نے راوند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "سہ  
چالی آگلی میں جا کتی۔" "تو مدنی گھر ایک توڑ  
لکھا ہوئے گھر۔

"تو لکھا بھی ممدنی۔" "مدنی اور ممدنی کے گھر میں  
کئی لکھا کے لکھا میں لکھا کہ ایک کا ہلٹ  
پہاں کی لکھا لکھا اور لکھا لکھا مگر لکھا کو لکھا میں  
کئی لکھا لکھا میں لکھا۔" "مدنی نے ایک کا ساتھ  
دیا۔

"متم نہیں کا ممدنی ہے کہ تم جیو چلی مگر کے کہنے  
ہو۔" "راوند نے مدنی کی جیو کو ممدنی سے  
کہا۔ "مدنی اب سہا راوند کے گھر چلا کر تو گھر چلا کر تو گھر



محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

”کیا کیا پاس ہے؟“ بھڑکی ہے۔ ”ایک۔“

المجلة العلمية

تو یہ واقعہ کہ جس جتنے اہل حق ہیں انہیں کمال  
اور جبرۂ نہیں دیا جہاں جس کے لیے جہاں  
حق کے لیے کمال ہے۔ جو وہ کہہ رہے ہیں کہ  
جس کے لیے کمال ہے۔

میرے چاہے خدا کا ملوک کر دے دنیا و مافیہ کو یا میں  
دے دوں اس کو جس کو چاہے۔ حاصل یہی کر رہا ہوں۔

میں نے بھی آپ کی خوش فہمی سے متاثر ہو کر ایک نیا تجربہ کیا۔  
 وہاں اعلیٰ کی باتیں اور اعلیٰ سے کی جانے والی باتیں تھیں۔  
 ایک نئے نئے تجربے اور انسانی طور پر لگنے والے تجربے  
 میں کہ انہی میں سے ہے۔"

آکھیاں تھیں کہ وہ بڑے چارہ۔

۱۲- سیکشنل اٹا ہو، تو آپ گھسٹیں چکاہو، گھسٹیاں لے لے  
مہرے میں ڈال دینے کر کال تک جہاں سے بھیچ دے گا شک

ہے یہاں اس کا نام ہے۔ اس کی شکل اس طرح ہے۔

پھر فکر کرو کہ یہی کھانا کچھ بھی بن سکتا ہے۔

میں نے بھی تو سوچا ہے کہ دیکھ دیکھ کر

کتابت کے لئے لکھ کر رہی ہے۔

گاہ ایک نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

ہمیں۔ میں ہمارا کیا کر رہی تھی۔ یہی بات کہیں

ہوئے کما اور لیکن سے آقا پر چلے ہوئے مڑ  
مگر اس سے آقا پر چلے ہوئے مڑ

یہ سب کچھ دیکھ کر آپ کو یہ بات یاد آئے گی کہ

۳۴ آخری جلد میں انھیں بھیجیں بہت اچانک محنت  
کر لی ہے۔ ۳۵ کے ساتھ ساتھ اس نے

”میلے والے آسمان ہے کہ لا کورنگ نہ پڑے“

ہائے آکھوت چہ ہوتے ہر چلہ "لغات دی تھیں  
 گل تو گدا سے ہر گھڑی تھیں "کے کھوت"

[illegible]

”اور انھوں نے کہہ دیا کہ تم لوگ اپنا دھرم اور تفکیک کا کوئی عقیدہ سچے دھرم پر نہیں رکھتے۔“ اور گاہک نے

کتاب: چارلس میں ایک واقعہ اور اس کے سبب سے

چاہتے ہیں اور ان کے لئے یہ سب کچھ ہے۔

حضرت گدیار بھی فرمایا کہ یہی سبھی حقیقت ہے۔

ہمارے اس کے کہ اسلام گیارہاگر چھاپنے اور بھی

کتاب نے تو نیکی کا کس کر لیا لیکن میں اس میں

ان کے چہرے کے لیے اس نام آواز نہیں کہہ سکتی تھی اور

نہایت گہری بات کہ کہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔

۳۔ پہلے وہ بات تو یہ چنانچہ ہی میں نے کہی تھی کہ جس کے لیے میری قید ہو گئی تھی۔ ”ایک نئے مسئلہ کی

ہر ایک کو اپنے آپ کو سچا اور فطرتاً ہی دیکھنے والے دیکھنے والے کے آگے  
 ہے۔ تاکہ کہیں اس طرح کا اولاد نہ ہو۔ آپ

”سچا تو یہ ہے چاری برا بھلا کیا کرتے گی اسے نہ گھر







اسی طرح کے کمری نظریہ دیکھ کر اس نے  
دوسرے ہی نظریہ کی طرف توجہ دینا شروع کر دی  
جہاں کسی بھی چیز کے لئے ایک ہی وجہ نہ ہو  
بلکہ اس کی وجہ سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

اگلے سال گھر میں اسحق کی دواستانا بھی ہوئی تھی۔  
 یہاں تھیں کہ سارا سارا سے لگے ہی ہو گئے،  
 نئی اسحق دواستانا رات الٹی جگہ سے کھلے تھیں  
 لگی تھی۔ جو رنگ لہجے کے پہنچاں پہ اسحق لگی  
 کی۔ اسے اس سے دور ہو رہی تھی۔ حالہ گھر کے



اسے سزا دے کر یہ مولانا لکھتے ہیں۔  
 اللہ کو اور ہم کو سب کے گناہوں سے معاف کرے۔

میں نے ان کو بتا دیا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔  
 کسی نے کہا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔  
 میں نے کہا کہ وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔  
 کہتے ہیں کہ وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔  
 وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔  
 وہ اس وقت بھی وہاں ہے۔

مذاہبِ ائمہ ہدایت سے ہے۔ جس نے  
حق تعالیٰ کو بھی باغلا۔

فکر کردہے کہ یہ ہے غیور ہے غیور کی معیت  
کی مرگ رہاں وہاں کھڑے ہو گئی اور حال بھی  
مستی عالی ہست حاصل ہوئی اس راجہ کے  
پیر معصوم اپنے سے ایک کو بھی اور سوت کے  
پاس میں یہ شخص کرواؤ کہ غریب آتے ہوتے  
چوہاں چھتے آتے کچھ برف میں دے دلی  
مرگ رہاں کہیں پہنچی کو گھر کے گناہ

اس گھر کی چوڑائی کم نہایتی زیادہ تھی۔ داخلی  
چاندنی سے گھر کا اندر کا حصہ ایک ہی دیاوار سے  
گزر کر پہنچا تھا۔ گھر کے اندر کے کمرے  
تھے جن میں سے ایک کمرہ کی چاندنی اور سرائے دوم  
کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ گھر کی دیواروں میں سے  
گھڑتے ہوئے آگے واقع گھر کے تقریباً چار  
سائے سے مشابہت ہوتا تھا۔ وہ گھر کے  
موجودہ حصے میں گھسلا ہوا تھا۔ ان کے کمرے  
ریخت سے چھلنے کی بنا پر گھر کی گلی کی دھول  
دیواروں میں رہنے کے لیے کچھ کچھ دھول کے لیے  
داخلی سڑک سے آگے دیواروں کی سطح پر چلتے تھے۔  
یہیں ایک اچھی بات تھی کہ گھر کے اندر کچھ  
کچھ کے گھر آتے تھے۔ گھر کے اندر کی چاندنی

[illegible]

اور گستاخ کابیل قاکر ملکہ کامافہ کو روکا۔  
 ہے۔ فہود انہوں نے قحطی کی وجہ سے کسانوں کے  
 کے بعد ان کی بیٹی کے لئے ایک اور گرم کرنے کے  
 لئے اس کی تعلیم ہوئی اور پھر میں دیکھ کر اس کی  
 اس معاملہ میں جو کچھ ملکہ نے کیا وہ سب  
 گمراہی تھی کہ ان کامافہ کی بیٹی کو روکا  
 ہوا تھا۔ یہ کہانیاں کے بعد میں نے کئی اور  
 گمراہی کی نظر کی جس سے ملکہ گمراہی کی  
 ضرورت تھی۔ یہ کہانیاں اور جو کہانیاں  
 تک پہنچی تھی اور ملکہ چاہی رہی تھی کہ  
 اس کے لئے کہانیاں ملتی رہیں۔

انہی کے قتل سے پہلے کہیں سے آئی؟ ماموں  
 نے تقریباً اسی سال کے بعد سے یہ اختیار لگا دیا  
 کہ اگر آپ کو ملے تو میں جیسا سمجھا مطلب  
 کہیں کہیں سے لی؟ ماموں نے اپنے سانس کی  
 دھند سے کہہ

”مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی اسلامی تعلیم کی کون  
 کون کیپ ہے تو آپ اسے بتائیے اور میں اسے لے گا۔“  
 راجہ نسلو سے نوازا حیران تھی۔ ایک کار کا ہوا  
 بائیں پہلو پر بیٹھا۔

میں نے سنا تھا کہ اس ولی نے بظاہر اور باطن کا  
 دان ہے، لہذا ہے سب جہات اور پوری کائنات کے  
 محسوسات میں اس کی شریعتیں کھینچے ہیں۔

نے جسے سے کہنے کا نام ہے۔ یہ کہانی سن کر میری کہانی



وہ اچھے وطن کے مہاجر ہیں اور میں آج اسے جیسا  
 وطن میں مست اور گم گئی۔ پھر میں اور خستہ  
 پہنچا کا کھڑے ملک کو اب کوئی اچھا بات سوجھتی  
 میری نہیں رہی کھنڈ کی گئی۔

○ ○ ○

اس دن سے بہت دنوں بعد مگر سے باہر گئی تھی۔  
 وہاں میں گئی وہاں کی مسلسل بارش کے بعد  
 سوچنے والوں کے پیچھے سے سر لگنے کی تھوڑی  
 کو کھنڈ کی گئی۔ بارش ہوتی ہے کھنڈے ہسپتال  
 کے لیے سوچنے کی۔ یہ جگہ کی گئی ہیں صحت ملیں  
 معلوم ہوئی تھی۔ خود معلوم کو بھی شاید مگر کے  
 تھوڑے سیل لےوا چلے سے باہر گئی کر لیا گیا۔ یہ تھا  
 جیسے وہ کی طرف چلے گئی تھی کہ اس کے بعد باہر  
 آئی ہے۔ بڑا سہرا مانی تھی اور ہاتھوں پر کھنڈ  
 لوگ سوچنے کی قسمت سے کھنڈ تھوڑے ہر گھ  
 اسی نے اسے کھنڈ کے امور سے سوا مطلب نہ  
 کے لیے بھی تھا۔

”تو کھنڈ سے گزرتے تو رقم کر کے کھنڈ  
 میں جیٹ کر لے اور سوا کھنڈ سے گزرتے اور اس  
 کے لیے لطف ہے۔ سوا ہر گھنڈ کر کے کھنڈ  
 میں جیٹ کر لے اور سوا کھنڈ سے گزرتے اور اس  
 اس کے کھنڈ میں کو بہت ہے۔“  
 ”میں سوا ہر گھنڈ“ تھی وہ بھی کہہ رہی۔ ”وہ سوا  
 رہی تھی۔ کھنڈ ہلے اس بعد کہ کھنڈ کھنڈ  
 تھا کہ نہیں۔“ آتھ میں کھنڈ اس ہنڈ کو کھنڈ سے  
 کھنڈ کے ساتھ لگے تھوڑے سے کھنڈ سے کھنڈ  
 تھی۔ اس ہنڈ میں مگر کے کھنڈ کھنڈ کے کھنڈ  
 اور کھنڈ کے ساتھ کھنڈ تھی۔ کھنڈ کھنڈ اس  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ

کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ

کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ

رہا وہی ہے اس کے کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ

کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ

کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ  
 کھنڈ کھنڈ کے ساتھ کھنڈ کھنڈ کے ساتھ



[illegible]

تھیں۔ صوبہ سرحد میں ان کی آمد پر ایک دفعہ  
 حیدر آباد میں ایک جلسہ ہوا۔ جس میں  
 قائد اعظم نے ان کی تعریف کی۔ ان کے  
 بارے میں ان کی تعریف کی۔ ان کے  
 بارے میں ان کی تعریف کی۔ ان کے

تو مجھے سچے سچے بعد سلوٹ آئی جی کے اسٹور سے باہر نکل گئی، اس کا وہ گلیا دار ہو گئی ابھی سے کہہ کر ابھی تو میں کے کمر کے بعد اسٹور کے کھانے کے میز ساٹھ کی گلی کی چوٹی پر کے کمر کی طرف

[illegible]

مفتی تو یہ کہتا ہے کہ یہ ایک جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو شرکت کرنی چاہیے۔ یہ ایک جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو شرکت کرنی چاہیے۔ یہ ایک جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو شرکت کرنی چاہیے۔

اس پر بھی وہ طرہوں کی کئی کئی تھانیاں ملتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس پر بھی دیکھ لیں۔  
اس پر اس نے ایک کے اس عمل کے بارے میں مشورہ کیا۔

”مردمان تمام انجیلی تارچیوں کو قتل کر کے دیے۔“



”ایک لڑکی ہے، اپنی دکان میں لکھ رہی تھی کہ  
 لڑکیاں کتنے دیتے ہیں۔“ اس کی طبیعت اچھا  
 تھا۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔  
 ”پہلی بار اس میں سے میرے بھی گے تھے۔  
 داخلہ فارم پوری پانچس تینے گا لیکن اس کے بعد  
 داخلہ کی کس سیکورٹی خوردبینی اعتراضات اس  
 نے ایدہ چار ملے ہوئے پر چھانڈا۔ وہ کون کون  
 گا۔“

”پیشہ عقلی سے لے کر لڑکی۔ جس نے سوچا  
 کوئی اچھا ہے۔“ اس نے کلمہ مجدد میں دیکھ کر  
 کے لئے۔ ”یہ بات کہ اس نے اس کے لئے  
 کی طرف سے تھا۔  
 ”مجدد میں کوئی نیا رہا ہے گا کیا اس میں نکل  
 کو لے کر ہے۔“ اس نے اس کے لئے سب سے  
 کی تھی۔ ”مجدد میں دیکھ کر کہ اس کی شکل  
 ان کے لئے ہو سکتی تھی۔“

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔

○ ○ ○

”اگر تو بہت چاہا لیکن اس میں پہلے داخلہ کی  
 ضرورت تھی۔“ اس نے اس کے لئے اس کے لئے  
 بعضی کم قیادہ لڑکیوں کو اگر چہ اس کے لئے  
 بزرگ کر کے کوئی نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے  
 داخلہ اس سے فارم خود کر رہا تھا اس کے لئے  
 اس کی تقویٰ نے ایک بار اس کے لئے اس کے لئے  
 دیکھ لیا تھا۔ اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے  
 اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے

”پہلی بار اس میں سے میرے بھی گے تھے۔“  
 ”مجدد میں دیکھ کر کہ اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔“ اس نے کلمہ مجدد میں دیکھ کر  
 کے لئے۔ ”یہ بات کہ اس نے اس کے لئے  
 کی طرف سے تھا۔  
 ”مجدد میں کوئی نیا رہا ہے گا کیا اس میں نکل  
 کو لے کر ہے۔“ اس نے اس کے لئے سب سے  
 کی تھی۔ ”مجدد میں دیکھ کر کہ اس کی شکل  
 ان کے لئے ہو سکتی تھی۔“

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔

○ ○ ○

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔

”اس کی شکل کا یہ انداز اور موافق اس کے  
 سامنے پہلے کی، اس کی شکل اچھی اور اس کا  
 کام میں بھی تھی۔  
 ”مجدد“ چند مسئلہ کے لئے کے بعد وہ خود  
 پر تھی۔ ”داخلہ فارم نے آنا اس کے لئے اس پر  
 سوچیں گے۔“ اس نے ایک اعلیٰ غیر حرج بات  
 کی۔



۱۔ حکمِ راجی ہے کہ

موتو پہلے انکی عمر کو پہچان کر لیا گیا ہے کہ وہ کون سے ہیں۔  
 وہ اپنے نام کے ساتھ اپنے آپ کی تصاویر بھی لے کر آئے ہیں۔  
 انکی طبیعت سے پتہ چلا کہ وہ کون سے ہیں۔  
 انکی عمر کو پہچان کر لیا گیا ہے کہ وہ کون سے ہیں۔  
 انکی عمر کو پہچان کر لیا گیا ہے کہ وہ کون سے ہیں۔

حکومت کی طرف اچھے پیمانوں - حکومت نے سہولت

تکلیف سے اس کی طرف توجہ نہ دیا جائے۔

میں نے اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ایک بار پھر اس معاملہ کو جانچ کر دیکھا تو حیرت انگیز طور پر یہ معلوم ہوا کہ

کے لیے ہیں۔ لیکن میں ان کا دل چاہتا ہوں کہ ان کے لیے بھی یہی ہو۔

[illegible]

نہیں۔ جس کی گواہی میں انہوں نے اپنے

۱۔ "حکومت کے اہلکاروں کا نظریہ ہے کہ  
 سوشل سائنس کے اہلکاروں کے پاس کوئی خاص  
 سائنس کا علم نہیں ہے۔"  
 ۲۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۳۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۴۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۵۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۶۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۷۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۸۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۹۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"  
 ۱۰۔ "اگرچہ سوشل سائنس کے اہلکاروں  
 کے پاس کوئی خاص سائنس کا علم نہیں ہے،  
 لیکن ان کے پاس ایک خاص قسم کی  
 سائنس کا علم ہے۔"

میں نے اپنے ایک رشتہ دار اور گمشدہ کے ساتھ اسے  
 کسی بھی زبان میں داخلہ دے گا مگر اس کا نہیں۔"  
 اپنے گھر میں اس کے اس وقت کے ایک عزیز کے ساتھ  
 ہوا تو وہ یہ کہتا تھا کہ میں نے اسے کبھی نہیں  
 دیکھا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا گھر تھا  
 جس میں ایک بڑا سا باغ تھا۔ اس کے پاس ایک  
 بڑا سا باغ تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا سا باغ تھا۔

ہیابہرے کے لیے کہ تو کالی اور ان کی کہانی  
 کہ جس نے پیدا ہوا کر لیا ہے وہ ہے سچا  
 اہل قریبہ قریبہ قریبہ ہی کسی مگر ہوتے  
 ان حالت میں عمل قریبہ ہی کالی قریبہ ہی کے  
 ساتھ ساتھ سو کالی اور اسلامیات کے ساتھ  
 مسیحیت ہی کے ساتھ کالی اس نے ہاتھ لگا کر  
 ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر  
 ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر ہاتھ لگا کر

بلکہ کامیاب شہر ہو گا۔ قند موہری کی خدمت میں  
 لی آئے گی۔ جس سے سڑک کے کنارے کے آگے کی  
 سڑک کے کنارے کو ان کے چاروں طرف سے  
 ایک چاروں کی بنی ہوئی خدمت کے لئے  
 رہو لائے گی۔ ان کی کی طرف سے ایک  
 رائے لائی ہوئے ہوئے کی طرف سے  
 ہو گا۔

میں نے بھی دھوپ کی کرنیں صحن میں بکھر رہی تھیں۔ اچھے دھوپ بھی ایک چادر چلی، چلی ترائی بھی۔ مٹی کی اعلیٰ شان، چڑی کی آوازوں

عروس نے کہی۔ میں اس قسمت کے لکھنے کی  
 طرف توجہ نہ دے گا، کیا کسی خاص میں یہ دکھ نہ ہو گا  
 کہ جس نے میری شادی کی ہے۔  
 "میرا نام کیا ہے؟" وہ اس کے لیے میں کی  
 عروس نے کہا۔

”خاندانی مفقودی اور قوم اور اہلادت میں نے ترک  
 کر دیا راستہ ایک کی انمول میں دیکھا تھا۔“  
 ”اگہ ہے اس۔“  
 ”وہاں پہنچنے کے پہلے ایک دہرہ ہم بنو کھڑے  
 رہتا ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے ایک دہرہ کھا  
 اس کی طرف پہنچا تھا۔“  
 ”تو ہم اس کے خوشی کی کہیں۔“

مطلوبت کے لئے تاکہ اگر اسے دیکھ کر خود بخود میں بکڑا  
اور حقیقتاً خود اس کی طرف سے چلے گا۔ خاصاً یہ اعتبار  
کرنا چاہیے کہ جو لوگ جس کے بل پر چاہتے ہیں وہ اس  
کی اس کے معنی میں کامل اعتبار سے اور جس کے لئے  
تے ہیں اسے وہ وہاں پہنچے۔ خود بخود ان کے لئے ایک  
حقیقی ہی ہے جو حقیقتاً خود بخود کی شانہ کے اعتبار سے  
کی کسی اس وقت کے لئے کہ وہ اس کے لئے کی جانے  
سے یہ اعتبار کی طرف سے اس کے لئے ہی ہے  
میں۔ خود بخود اس کے لئے ہی ہے کہ اس کے لئے ہی  
نے ایک کو خود بخود بکڑا کر خود بخود کی طرف سے  
وہ ہیں کہ خود بخود اسے وہ وہاں پہنچے۔ خود

اس نے یہ باتیں سوچتے ہیں ایک۔ یہ بھی غلط ہے کیا قاتل اور قتل شدہ ایک کے ساتھ ہیں جسے کہ خود کو کشتن کی گت کی طرف جھٹکے گی اس کا دل میں غلطی ہوتا اور یہی جیسا اس کا مقصد بھی تھا قتل کے لئے وہی ہے وہ صرف ایک سوچنے کے کرکھر کے تھی ہو۔

"ہرگز سرے میں جتنی بھی لبرل کے کہیں  
نہ ملے ایسی کوئی کونج ہے کہ چاہے وہ ایک شخص

بھولے تے جی تھوڑے جھوٹے لہوڑے کے زلم چرسے  
ہو جائیں۔ جیسی جیت تھوڑا سا لہوڑے سرور  
جیتھ کو پھولی جس طرح جان بھروسے طورے جس  
لہوڑی کی فعل تو کیا کھنکھانی لہوڑی ہے۔

اسوں نے ایک سالہ سرور  
مہرہ جی نہیں کیا۔ جس لہوڑی جیتھ ہم  
بھنے سوچ کر پھول اپنا لہوڑے لہوڑی کر رہے۔  
تھوڑا لہوڑی لہوڑے کر لہوڑے تھوڑے لہوڑے لہوڑی  
ہوت ہوئی گئی۔

کینے کو تو لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
کینے کو تو لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
کینے کو تو لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

○ ○ ○

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے

لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے  
لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے لہوڑے









ہائی غوروں کی طرف ایک ہی اندر میری طرف اشارہ کیا۔

”ایک اسی جلدی سے لوہہ اڑو کچھ حساسی رہا کہ کن کن کی سڑک کے طور پر گاس سے باہر کھڑی ہے جس کی حالت سے وہ جلد باز حرکت کی طرف گرا تھا۔“

”یہ لڑکی رات کو اور اس کے دو بچوں کو سب سے پہلے دانت پہنے۔ خدا کی بات یہ خدا جانے کب یہ لوگ کالج سے فارغ ہو کر ریل سے وطن ہوں گے۔ یہاں ہی اچھے اسکول سے وطن ہو گئے تھے کم پڑھ ان کے اسکول سے جانے کے بعد وہی میں نے سکھ سے چھٹا کر دیا یا قہر پہل سے لگتے لگتے نہیں کتہ وقت گئے تھا اس وقت تک کہ گھوڑوں سوارانہ رات کو پہلے پہل ہی سواروں کی اس کال اسپا آج وہ گئے تھے لہذا جلدی رات کو کے جانے پر وہ آج کھڑی سے پہلے گھر آگیا تھا میں نہیں سمجھتی حرکت پر وہ کھڑی چلی جا رہا تھا اس کال اسپا سے وہ عالم کھیل میں کے اساتذات کا ہونڈ گل جانے والا ہوئے مصلحت کی فاکٹ ہونے پر وہ وہ ساری چھ مہینے کے لیے اسٹریچر پر جا گئی۔ نہ تو اس کی کلاس ہوئی نہ ہی سڑک کے لیے۔ لیکن اس بل کے جانے کا ایک ہی یہی فرسٹ سی لائن میں چلتا ہے۔“

○ ○ ○

اس سہولت کے تحت میں اسے سڑک سے اسی دھڑکا تھا کہ میں نہیں لیکن اس سوارانہ جانے سے وہیں آئے ہوئے اس نے اسے شوق پکڑا یا قہر کالج سے واپس ہی اس نے ڈاک خانے جانے کے لیے وہ رات کو اختیار کیا تھا وہ اسے اس نے ڈاک خانے ہی کا کہنا تھا کہ اس رات ہی یہ لڑکھو تو گول کا کا پتا نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ بہت سی کامیابی کا لہجہ والی باتیں سنیں اس نے اسے اس کی کلاس تیار کی تھی وہ کرنا تھا کہ ایک بار گھر کے فرش پر میں کھلنے لے

اسی کی باتیں کرتے ہیں پچھلے سے لڑکھو کھور ہو رہی تھیں اور وہ پانچواں سے آٹھ دہائی تک قافلہ بھی پھیلنے لے گئی تھیں اسی نے گھر سے باہر کے داخلی ضروری کام حرکت کے سوا۔ اپنے بچے۔ آستین لٹان، ہوا دھونکی سے ملنے کی بجائے کھلی میز اور پانچواں تھا لیکن اس کی جگہ کی جگہ تک انکھار کے لیے وہ اس کے گزرنے کے سبب سے اس کے کہنے پر ڈاک خانے تک چلا چڑھا تھا وہ رات کو داخلی سٹیشن اور غریبوں کے ہسپتالوں میں پائی قافلہ سے کہنے میں مضمون میں اس کی ایک کی سوار ایک اس کے قریب کر لی تھی۔

”ہم وہ کسی مقام پر کے لیے اس نے سہولت کے چوک کر رکھا جانے پر اگلی کا اشارہ کرتے ہوئے پر پھا تھا اور اگر وہ اس کے جانے پر اسے رات کے جانے سے پہلے سٹیشن کی طرف چلی ہوئی۔ میں کچھ نہیں پچھتے وہ سوار ہی تھی نہ چھتے اس کے قریب رہنے والا ایک نہیں بچھا ہوتا ہوا اسے جی بھڑک کر کھانا کھا رہا تھا۔“

”آج کا خانے میں اس کے قریب ہی ایک سہولت ہے جو کہ قہر میں کر کے ہے۔“

”آج کا خانہ کھن کھن کھن ہے جس نے اسے سہولت کی باتیں۔ جس نے ہی سڑک پر اسے سہولت کی باتیں کی تھیں وہ اس کی بات ہے۔“

”یہ قہر کھن کھن کھن ہے جو اس کی بات ہے۔“

”یہ قہر کھن کھن کھن ہے جو اس کی بات ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM





[illegible]

میں نے اس کے لئے ایک اور کمرہ بنوا دیا۔  
میں نے اس کے لئے ایک اور کمرہ بنوا دیا۔  
میں نے اس کے لئے ایک اور کمرہ بنوا دیا۔

حقوقہ اسلامیہ کی ان حسنی میں پھیل کر  
 پھیل گیا جب تم اس کو بھی جس نے ایک  
 کیلئے دے گا وہاں  
 چاہے کون سا ہو اس نے ایک سو تو بھیجے۔

مستعدی اور تہمتیں چھوڑ کر ان کی جگہ پر  
نے ایک کی بات کا جواب دینے کے لئے اس سے  
سوال پوچھ لیا۔ "مجھے یوں کہہ تواریز یاد ہیں جو  
فکر کے لئے کے لئے اور شوق کے لئے

میں نے انکے لیے ایک بڑی سیڑھی بنوائی جو ان کے پاس سے گزرتی ہوئی تھی۔

وکتلس کی کامیاب مداخلت سے پڑا ٹھکر آپریشن  
کی صورتی انٹرنیشنل کے قریبی چکن کاسٹیڈیاں اور اس کی  
بجائز بھی مندی ہی تھی۔ جاتی ای ہمارے گاہک

702-222-2222



کئی بار کے طور پر کھیں۔ یہاں پر کئی ایک عیسیٰ  
میں ہیں ہے کئی خدا کا واحد عصب و ریش  
طیقت تو غراب نہیں ہے کئی اس کی کھلی پہاڑی  
ہوئی ہے اس سے لگے ہی پورا اسوہت کے  
کئی میں ہر ایک کے گرد ہی گئے  
کئی پہاڑی ہے کئی کئی کے لئے لواتے  
کئی کے کیت سے امداد کے دیکھنا لگے۔ غور نے  
اہل ہوا۔  
"آئیے" وہ دیکھ کے بہت ہی جیت ہی لہر ایک  
اپنے ہم میں ہی کئی کئی کے لئے۔

[illegible][illegible]

”تو نہیں ہے۔ کیا کل تم پہاڑوں کی خانہ میں سوار  
سائیکل دوڑاتے تھیں مگر سب نے ’گھیریں لوہر  
ہاڑا لٹکے۔‘“  
”تو تو ان لوہر خاندان کی دیکھتے تھے کہ ان کی خانہ  
میں اس کے کہ پہاڑ سے لڑی ہو چکے ہیں پہاڑ سے  
’آج کل تک۔‘ وہ اپنے کی لٹیکیں ہمارے ہاتھ سے  
میں جاتے ہوئے تھے۔“

[illegible]

۱۰۰  
 ۱۰۱  
 ۱۰۲  
 ۱۰۳  
 ۱۰۴  
 ۱۰۵  
 ۱۰۶  
 ۱۰۷  
 ۱۰۸  
 ۱۰۹  
 ۱۱۰  
 ۱۱۱  
 ۱۱۲  
 ۱۱۳  
 ۱۱۴  
 ۱۱۵  
 ۱۱۶  
 ۱۱۷  
 ۱۱۸  
 ۱۱۹  
 ۱۲۰  
 ۱۲۱  
 ۱۲۲  
 ۱۲۳  
 ۱۲۴  
 ۱۲۵  
 ۱۲۶  
 ۱۲۷  
 ۱۲۸  
 ۱۲۹  
 ۱۳۰  
 ۱۳۱  
 ۱۳۲  
 ۱۳۳  
 ۱۳۴  
 ۱۳۵  
 ۱۳۶  
 ۱۳۷  
 ۱۳۸  
 ۱۳۹  
 ۱۴۰  
 ۱۴۱  
 ۱۴۲  
 ۱۴۳  
 ۱۴۴  
 ۱۴۵  
 ۱۴۶  
 ۱۴۷  
 ۱۴۸  
 ۱۴۹  
 ۱۵۰  
 ۱۵۱  
 ۱۵۲  
 ۱۵۳  
 ۱۵۴  
 ۱۵۵  
 ۱۵۶  
 ۱۵۷  
 ۱۵۸  
 ۱۵۹  
 ۱۶۰  
 ۱۶۱  
 ۱۶۲  
 ۱۶۳  
 ۱۶۴  
 ۱۶۵  
 ۱۶۶  
 ۱۶۷  
 ۱۶۸  
 ۱۶۹  
 ۱۷۰  
 ۱۷۱  
 ۱۷۲  
 ۱۷۳  
 ۱۷۴  
 ۱۷۵  
 ۱۷۶  
 ۱۷۷  
 ۱۷۸  
 ۱۷۹  
 ۱۸۰  
 ۱۸۱  
 ۱۸۲  
 ۱۸۳  
 ۱۸۴  
 ۱۸۵  
 ۱۸۶  
 ۱۸۷  
 ۱۸۸  
 ۱۸۹  
 ۱۹۰  
 ۱۹۱  
 ۱۹۲  
 ۱۹۳  
 ۱۹۴  
 ۱۹۵  
 ۱۹۶  
 ۱۹۷  
 ۱۹۸  
 ۱۹۹  
 ۲۰۰

مکتوب میں لکھا تھا کہ اسے ۲۰ لاکھ روپے ملے ہوں گے۔  
 وہاں میں تو مر کر بھی لوٹ کر جانا ہوتا۔ کئی مکتوب  
 پر جہاں سستی کے بندوبست تھے۔ وہ مر گیا۔  
 فاک جی جاکر سہیل۔

میں نے اس کا جواب دیا کہ میں نے اس کو اپنے لئے نہیں لیا ہے۔











فرمان کیا بھی تھا۔

”تو مجھ کو یہاں پر یہ اہل تشیع کیسے تکسیر کر رہے ہیں؟  
ہم اس کے بگڑنے سے پہلے ہی روک لیتے تھے۔  
تو اب تو میرا گھبراہٹ ہو رہی ہے۔  
بڑا کھٹک رہا ہے۔“  
اس نے غصہ پھٹ کر کہہ دی تھی ”اچھی غصہ کر  
خلوت گاہ اس کی بجائیں سے مل کر میں خلوت و خلوت  
ہو گیا تھا۔ اب تو یہاں تکسیر کر رہا ہے۔  
وہی تھی کہ وہ وہاں تھا اس پر حملہ کر رہا تھا۔  
اور میرے اندر بھی اس نے صوبہ کے دروازے پر حملہ کر دیا  
کہ وہ تو کئی دن کہہ رہی تھی۔ یہاں تکسیر سے نہیں  
تھک کر اس نے پھر سے جڑا انتخاب کر لیا ہے۔ یہ تو  
وہی ہے جو اس کا گھر ہے۔“

”جس کی اگر تھی۔“ اس کے ہاتھ کے بعد ایک  
نے بڑا کر دیا۔ ”کہنا چاہئے کہ اس کے اس سوا  
مذہب کا کوئی فلسفہ کی خاطر تھی یہاں پر ایک ہی۔  
لیکن کرنا چاہئے۔ کہنے کی سہولت تو فور  
کہنے کی صلاحیت سے اس قدر محروم ہے۔ جس کی  
ظہر ظہر کے سلطان سے لگاتار ہو رہا ہے۔  
یہ ہونے۔“ ہے عقیدہ اور ہے ہمارا ایمان۔  
نے اس سلطان کی طاقت کا کوئی انکشاف ہونے چاہئے۔  
اس کی ہی نے بھی کیا اسراف کے انھیں چاہئے تو  
وہ ایک شخص سب لکھو۔“ اس نے سر ہٹا کر اور  
چراغ کھول کر ان کے درمیان رکھے ایک کپ  
تیک لیا۔ اس کے ساتھ دھڑک دھڑک کر مٹی کی سوم  
تھیں کے کچھ کو حشرانہ غصوں سے کھیل

”معدہ فکر ہے کہ میں یہاں تکسیر کر رہا ہوں۔  
کہنے کا تو یہاں پر عادی ہے۔ اس سے بھی نہیں چاہئی  
کہ اس کے اصل سبب کا کھولنے سے مٹی توڑ رہی  
بھی نہیں کہ وہاں کے فلسفے میں ان کی ان کی تھیں کے  
مذاہب سے ملتا ہے۔ یہی وہ سبب تھا کہ غرض یہ کہ  
یہاں تکسیر میں نہیں۔ کہہ رہا ہے کہ یہاں تکسیر  
تو یہاں تکسیر ہے۔ اس سے پہلے میں سے وہاں تکسیر  
ہی ہے۔ اس کے انھیں گنا ہے بہت بھروسہ ہے۔“

”کپ تکسیر وہم ہی کے یکسو نہیں تھیں بلکہ  
تھی یہی وجہ تھی۔“  
”کہاں تکسیر گنا چاہئے کہ اس سے پہلے  
کی ایک طرح طرح سے کہنے کے بعد اس کے  
میں ایک بار بھی نہیں گئی تھی۔ اس رات اس میں  
لیٹ کر سو گئی تھی۔ اس کے کہنے کے بعد اس کے  
دہن میں کرنیکی طرح سے آگ لگی تھی۔“

”محمدؐ کا بیٹا ہے۔ یہ تو اس کے بیٹا ہے۔  
غرض کہ اس کے بیٹا کے بیٹا کے بیٹا کے بیٹا کے  
تھیں۔ اس میں دھڑک دھڑک کر اس کے بیٹا کے  
تھیں۔ اس کی غرض تھی۔ جس میں غصہ سے  
اور خشم کی آواز تھی۔“

”یہ تو اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
دیکھتے ہیں کہ یہاں تکسیر اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
طرح طرح کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔“

”یہ تو اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔  
تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔ اس کے تھیں۔“





# محکم دلائل سے مزین مکتبہ خوارزمیہ

ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقہ میں ایک اپنی والدہ صالحہ بیگم اور بڑے بھائی اور نگ زیب کے ساتھ مقیم تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

حافظ رائے ایک اور ظفر دوست تھے۔ وہ انجینئرنگ کے طالب علم تھے اور ایک پروجیکٹ پر مل کر کام کر رہے تھے۔ وہ سب ایک کے گھر جمع ہو کر کھانا اٹھڑی کرتے تھے۔

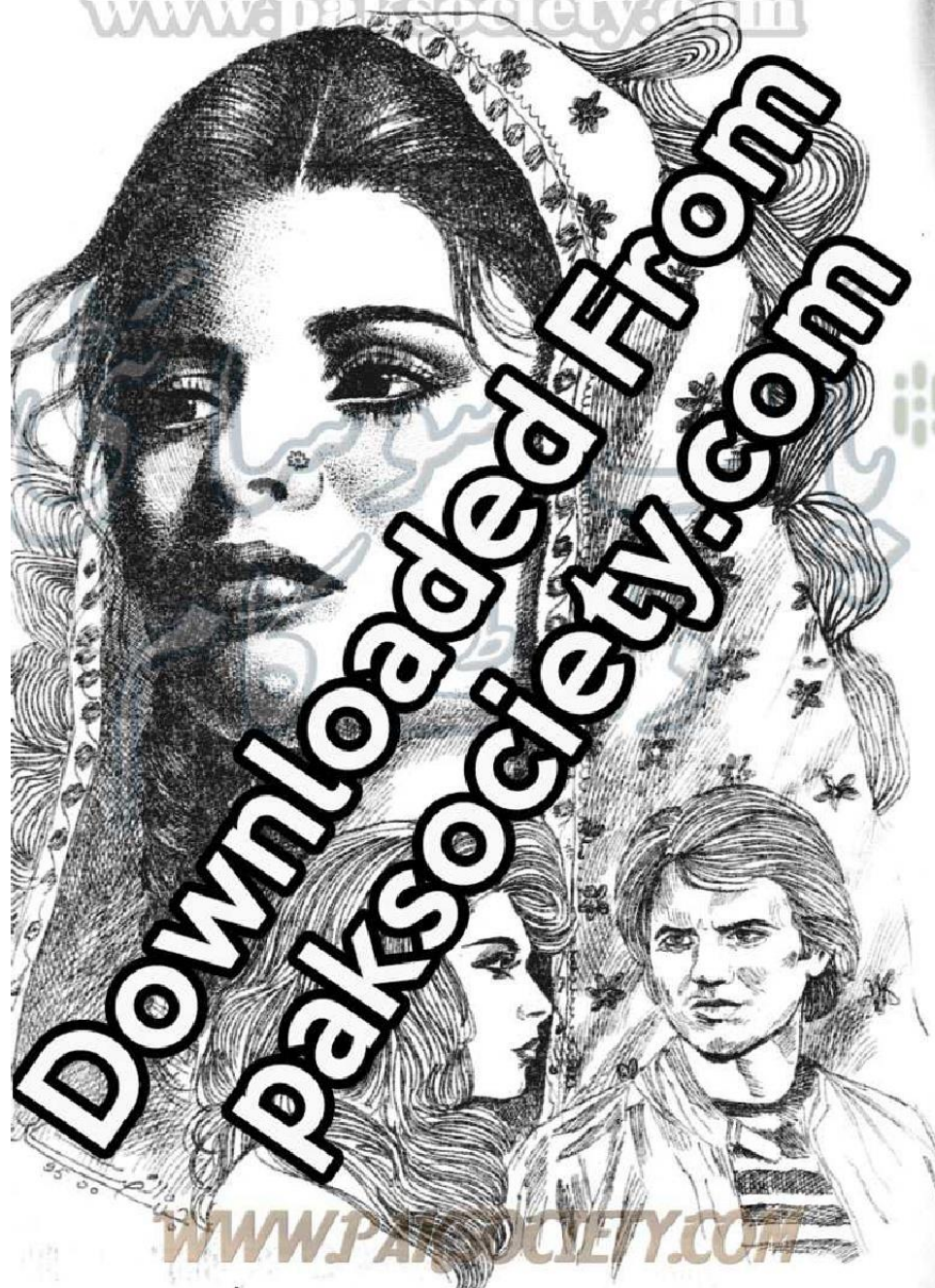
ایک کے گھر کے چلے حصے میں اس کی چچی قمر آرا اپنی بیٹی سلوت کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک کے چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ قمر آرا کی زبان درازی سے ایک کے دادا عاجز تھے۔ انہوں نے قمر آرا کو اپنے بیٹے کے انتقال کے بعد گھر کے چلے بورڈ میں جگہ دی تھی جو بہت تاریک اور سیلن زدہ تھا۔ قمر آرا کا کردار مشکوک تھا اور وہ اس کے کردار کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ صالحہ بیگم قمر آرا سے نہیں ملتی تھیں۔

قمر آرا شدید بیمار تھی۔ سلوت پر بھائی میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ایک رات شدید سرری میں ایک قمر آرا اور سلوت کی گفتگو سنتا ہے تو انہیں استری کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے گھر کی استری انہیں دے دیتا ہے۔ پھر ایک کو بتا چکا ہے کہ قمر

مکتبہ خوارزمیہ

Downloaded From  
Paksociety.com





آرا کر پانہ اسٹور کے مالک کی مقروض ہے تب وہ سارا قرض بھی ادا کر دیتا ہے اور سطوت کو آگے بڑھنے کے لیے کہتا ہے وہ سطوت کو وقت دینے کے لیے اپنے دوستوں سے دور ہوتا ہے تو راستہ مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے یہ سوچ کر جلن محسوس ہوتی ہے کہ ایک کی زندگی میں کوئی لڑکی مگنی ہے۔

### دوسری اور آخری قسط

واپس اس وادی میں لوٹے تھے۔ اس کو خاموش یا کر وہ اپنی پائیک کی طرف چلا گیا تھا اور ایک دو لمحوں کے بعد واپس اس کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔

”جھا چھوڑو یہ لوہ میں نے تمہارے لیے بنایا ہے۔“ اس نے چونک کر دیکھا کہ زرد و سفید خود دو ڈیریز کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا۔ زرد پتوں کے مرکز کے گرد گھلی سفید پتیاں۔ یہ پھول بہار کی کند پر پوری وادی میں جا بجا نمودار ہوئے لگتے تھے اور ہوائے گردش پر ایک مائوس سی خوشبو سارے علاقے میں پھیلی رہتی، کچھ دیر پھولوں کو دیکھتے رہنے کے بعد سطوت نے نظر اٹھا کر ایک کی طرف دیکھا۔

”لو، تمہارا برتھ ڈے گفٹ ہے۔“ اس نے پھولوں والا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ سطوت نے خشکی سے منہ موڑ لیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ساتھ اپنی سالگرہ منانے کا خیال آیا تھا جب ہی اس نے اس بے وجہ خریداری کے ساتھ وہ ننھا سا کپ کیک اور گلابی سفید دھاریوں والی مٹی سی موسم پتیاں بھی خرید لی تھیں۔ گزرا کل جس میں وہ ایک انجیل سی مسرت میں گرفتار تھی اور مسرت کے ان لمحوں نے شاید واقعی ہی اسے اپنی اوقات بھلا دی تھی تب ہی تو اس نے وہ بے ہتکم خریداری کر ڈالی تھی۔ جس کی وجہ سے اس گزرے ہوئے کل کی شام اس کامل اواس رہا تھا۔

ایک ان جانی سی چٹک کے احساس نے رات بھر میں اس کا سر ہانہ بھگڑا لایا تھا۔ اور وہ جو اس ساری اداسی کی وجہ بنا تھا وہی آج اس کے سامنے کھڑا اس کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر اسے وہ پھول پیش کر رہا تھا۔ وہ ہٹا کون تھا؟ آخر وہ ہٹا کون تھا؟ طیش کی ایک نئی لہر

بلین اس کی نظروں میں ایک کی پائیک کے ساتھ لٹکے شاپر سے جھانکتے پھولوں کی جھلک کھب سی لگی تھی۔

”مجھے آج لوہر نہیں آتا تھا لیکن بھر آئی صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میں کل سے سیدھے اور چھوٹے راستے سے واپس گھر چلی جایا کروں گی۔“ وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ رو بھی ہوئی آواز میں اسے بتا رہی تھی۔

”جھا، لیکن کیوں؟“ ایک نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ویسے ہی۔“ اس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ ”مجھے واپسی پر دیر ہو جاتی ہے اور روزانہ ای سے جھڑکیں کھانی پڑتی ہیں۔“

”واہ! وہ محوم کراس طرف آتے ہوئے بولا جدھر اس نے اپنا منہ موڑا تھا۔ اتنے دنوں بعد ای کی جھڑکیں بڑی لگی ہیں۔“

”بری نہیں لگیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”مجھے ان کی علوت ہو چکی ہے اور خود کو بڑی علوتیں بڑی نہیں لگا کرتیں۔ بے شک بندہ انہیں چھوڑ دینا چاہتا ہو۔“

”سچ کہہ رہی ہو تم۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”جیسے اس راستے سے گھر واپسی کی علوت۔“ وہ کوہلوں پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”جو تمہیں پڑ چکی ہے۔“ وہ پورے یقین کے ساتھ مسکرایا تھا۔

”اور اب تم چاہے اسے چھوڑ دینا چاہتی ہو لیکن یہ تمہیں بڑی نہیں لگتی۔“

جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔ اس کی نظریں صاف، کٹے، نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں پر جمی تھیں۔ پرندے جو پورا موسم کسی اور نگر میں گزارنے کے بعد



”خود کو اور اپنے بار کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔  
کہا اور ہونٹ ہینچ لیا۔  
”کیوں چھوڑ دوں۔۔۔ میرا داغ ہے ہی ایسا!“  
”اس لیے چھوڑ دو کہ میں کہہ رہا ہوں۔“ وہ ایک  
بار پھر اٹھ کر بائیک کی طرف گیا۔ اب کے وہ اس شاہر  
سے جس میں سے پہلے اس نے ڈیزیز کا گلدستہ نکالا تھا  
کیک کا ڈبہ نکال رہا تھا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے ڈبے کا ڈھکن کھولا۔ ایک  
پاؤنڈ کا چھوٹا سا کیک جو اسٹرابیریز اور چاکلیٹ سے سجا  
تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔  
”میرے ایک بچہ ہیں سر صابر!“ کیک پر وہی ہی  
ملائی اور سفید دھاری دار موم بتیاں سجاتے ہوئے وہ  
کہنے لگا۔ جیسی گزیرے کل میں اس نے اس کے  
سلمان سے نکال کر واپس چاچا تاج کے شیفت پر  
سجادی تھیں۔

”رات جب میری سوجھ میں آیا کہ وہ کپ کیک اور  
موم بتیاں تم سے چھین کر میں تمہارے ساتھ لیا دیتی  
کر بیٹھا ہوں تو میں نے سر صابر کو فون کیا۔ ایک ایک  
کر کے موم بتیاں کیک کے اوپر سجاتا وہ بولتا رہا تھا۔  
”وہ کل اسلام آباد گئے تھے اور انہیں آج صبح کلج ٹائم  
تک واپس پہنچنا تھا۔ میں نے سر صابر کو فون کیا اگر وہ  
اسلام آباد کی کسی ٹیکری سے میرے لیے ایک پاؤنڈ کا  
کیک لے آئیں تو میں ان کا بڑا ممنون ہوں گا۔“ وہ  
مسکرا دیا۔

”چلو برتھ ڈے کر لیں! ایک کانو۔“ اس نے موم  
بتیاں جلا کر چھری اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا  
تھا۔

منے سے ایک کپ کیک پر اکیلے سا لگہ منانے میں  
شاید وہ مزانہ آتا جو اس طرح غیر متوقع طور پر سا لگہ  
منانے میں آ رہا تھا۔ سڑک کنارے پتھر پر بیٹھی وہ کیک  
کٹ رہی تھی ایک تالیاں بجاتے ہوئے اس کے  
لپے سا لگہ کے گیت گار رہا تھا۔ فضا میں اڑتے پرندے  
ارد گرد ہوا کے دوش پر سرسراتے ہلکے وزن کے

اس کے رگ وے میں دوڑتی۔ تیز گرم خون اس کے  
چہرے کو سرخ کر گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی  
اترنے لگی تھی۔

”میں بہت احمق ہوں۔“ اور وہ اس کے سامنے  
ایک اونچے پتھر پر بیٹھا اعتراف کر رہا تھا۔ ”دل کے  
بجائے داغ سے سوچنے کا جو عادی ہوں۔“ اس کے

چہرے پر دکھ نمودار ہوا۔ ”لیکن یقین کرو میں بے حس  
اور سرد مہرہ رگز نہیں ہوں۔“

”پتھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“ ایک بے بس اور بے  
جان سا شکوہ سطوت کے ہونٹوں سے باہر نکلا۔

”اس لیے کہ میں اپنا حساب کتاب سیدھا رکھنے کا  
عادی ہوں۔“ وہ تیزی سے بولا تھا۔ ”میری جیب کی  
استطاعت کیا ہے۔ میں اس سے غافل نہیں رہنا چاہتا  
ہوں۔“ یہ سطوت کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ  
سوچ رہی تھی کہ اس نے یہ جواب کیوں دیا تھا۔ لیکن  
یہ ہی اس کے سوال کا جواب تھا۔ وہ بات جو تاج چاچا  
کے سمجھانے اور اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود اس  
کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس وقت لمحہ بھر میں آئی  
گئی۔

”تم نے امی کے کھاتے کا حساب چکا یا تھا؟ وہ تم  
تھے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے۔  
حیرت کا ایک سمندر تھا جس میں وہ پھکولے کھاری  
گئی۔

”ہاں۔۔۔ وہ میں تھا۔“ ایک نے سادگی سے  
اعتراف کیا۔ ”حیرت ہے تم نے ایک بار بھی غور  
نہیں کیا کہ وہ کھاتہ آپوں آپ کیسے کھیتے ہو گیا۔“

”اس لیے کہ میرا داغ بہت ہلکا ہے۔“ وہ سر جھکا کر  
بولی۔ ”تم نے دیکھا نہیں؟“ ایک عام سا سادہ سوال بھی  
بہت دیر میں سمجھ پاتی ہوں۔“ پھر اس نے سر اٹھا کر  
سورج کی کرنوں سے بچنے کے لیے آنکھیں میچتے ہوئے  
ایک کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں پتا تو ہے میں نے  
اسکول میں بھی اسی ہلکے داغ کی وجہ سے ایک ایک  
کلاس دو دو سالوں میں پاس کی۔“



پودے، جھاڑیاں، جھاڑیوں میں چھپی نکلتی گھبراہٹ،  
چھلانگ لگاتے بندر، اونچے پہاڑوں سے بہتے جھرنے  
سب کے سب اس کی خوشی میں خوش نظر آنے لگے  
تھے۔

پہاڑ کے اوپر سے اپنی بکریوں کا ریوڑ لیے نیچے  
اترتے ایک شرمیلے و سفید چھان لڑکے نے ذرا دیر کو  
رک کر ہستی ہوئی اس لڑکی اور گاتے ہوئے لڑکے کو  
دلچسپی سے دیکھا اور پھر مسکرا کر آگے چل دیا۔ سطوت

نے اس روز ایک سے کتاب کا ایک بھی سبق نہیں  
پڑھا لیکن اس کئی گفتگو میں جوان دونوں نے اپنے  
اپنے پتھروں پر بیٹھے اور پھر اونچے نیچے راستے پر چلتے  
ہوئے کا کبھی زندگی بھر کے لیے ہمت سے سبق پچھے  
ہوئے تھے۔

”تم کیوں کر رہے ہو یہ سب میرے لیے“ چلتے  
چلتے رک کر سطوت نے اس سے پوچھا تھا۔ ”بھول  
گئے ہو کہ میں قمر آرا کی بیٹی ہوں اور میری امی نے  
تمہارے بابا اور دادا کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں کیا، تم  
بھول گئے کہ تم، تمہارا بھائی اور تمہاری امی کے میری  
امی سے کیسے تعلقات تھے۔“

”نہیں، میں بھولا تو نہیں ہوں۔“ وہ جیکٹ کی  
جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا تھا۔ ”لیکن میرا  
کنسرن تمہاری امی تھوڑی ہیں، میرا کنسرن تو تم ہو۔“  
وہ اس کے عین سامنے کھڑا ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”کنسرن!“ سطوت نے ذرا دیر اس لفظ پر غور کیا۔  
”اور میں تمہارا کنسرن کیوں ہوں؟ اس نے آنکھیں  
سکھرتے ہوئے سوال کیا۔

”پتا نہیں۔“ وہ شانے اچکا کر بولا۔ ”یہ تو مجھے خود  
بھی پتا نہیں۔ لیکن تمہاری مصیبتیں پریشانیاں،  
دکھ، فکر اور مسائل مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرا دل چاہتا  
ہے کہ تم ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزارو۔ جیسی  
میں بابا اور دادا تک زیب بھائی گزارتے ہیں۔“

”تم اور تمہارا بھائی ایک مطمئن اور پرسکون زندگی  
اس لیے گزار رہے ہو کہ تمہاری ماما کا نام قمر آرا

نہیں۔“ دنیا کی سب سے ترین حقیقت کا بیان کتنا مشکل ہوتا  
ہے یہ اس روز سطوت کو پتا چلا تھا جب ہی اس نے یہ  
بات کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”اس میں تمہارا کیا قصور ہے کہ۔ تمہاری امی کا  
نام قمر آرا ہے۔“ جواب میں وہ ٹھہری ہوئی آواز میں  
بولا تھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ میرا کنسرن تم ہو، قمر آرا  
نہیں۔“

”تم امتحان ہو شاید۔“ سطوت نے آنکھوں میں  
اند تابی دھکیلے ہوئے کہا۔ ”قمر آرا ہی تو میرا قصور

ہیں۔“ اس کی آواز لرزی۔ ”تم نے نہ کھا اور سنا نہیں  
یہ جان کر کہ میں ان کی بیٹی ہوں لوگوں کی نظروں اور  
بے چارے میرے ساتھ بدل جاتے ہیں۔“ وہ پلکیں جھپکے بغیر  
اسے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن تم کیوں دیکھو اور سنو گے بھلا۔ بے عزتی،  
وہ تحقیر، وہ معجزہ اڑانے کا سا انداز جسے صرف میں ہی  
محسوس کر سکتی ہوں، تم کیسے کر سکتے ہو۔ تم تو خود ان ہی  
لوگوں میں سے ایک ہو جو یہ کہتے ہیں کہ مجھے تماشہ بننے  
کا شوق وراثت میں ملا ہے۔“ اس کے ہیکلے لہجے میں  
غراہٹ کی جھلک ابھری۔

”میں دیکھتا بھی ہوں اور سنتا بھی ہوں۔“ ایک  
نے نرمی سے جواب دیا۔ ”اسی لیے تو سائے کی طرح  
تمہارے پیچھے لگ گیا ہوں۔ اس استہرا، تحقیر، معجزہ  
اڑانے کے سے انداز سے تمہیں پہچانا چاہتا ہوں۔ میں  
چاہتا ہوں کہ ہر جگہ تم اپنی وجہ سے سر اٹھا کر جینا  
شروع کرو۔ وہ لوگ جو قمر آرا کی بیٹی سمجھ کر تمہارا مذاق  
اڑانا چاہتے ہیں، تمہاری تحقیر کرنا چاہتے ہیں، تم سے  
فلرٹ کرنا چاہتے ہیں، ان کے قدم اپنی اپنی جگہ پر رک  
جائیں اور تم پر نظر پڑتے ہی انہیں محسوس ہونے لگے  
کہ تم قمر آرا نہیں، سطوت سجاد ہو۔ جوان کی طرح کے  
لوگوں کے منہ توڑنا بھی جانتی ہو اور سر اٹھا کر جینا بھی  
جسے آتا ہے۔“

سطوت کو ایک ایک کر کے وہ سب کچھ یاد آنے لگا  
جو ایک نے اس کے لیے کہا تھا۔ ہاں۔ وہ اسے ایک

”وہ“ رائیہ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ ایک کے متعلق کھٹک گئی تھی پر اتنی وضع واری اس میں ضرور موجود تھی کہ وہ ماں اور بیٹے کے درمیان محرم اور اعتبار کے رشتے کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”وہ ایسا کیوں کر رہا ہے“ کیوں اس نے اپنی روش بدل لی ہے، وہ بھی اچانک اور غیر متوقع طور پر البتہ اس کے اپنے اندر نئے نئے سوال اٹھنے لگے تھے اور وہ ان ہی میں سے ایک سوال اور تک ذیہ بھائی سے کر بیٹھی تھی۔

”چھا لوہ تم لوگوں کو بتائے بغیر کہیں نکل جاتا

نئے راستے پر ڈال چکا تھا۔ سرائیہ کرہینے کا راستہ بد نظر اور بد لحاظ لوگوں کی پیش قدمیوں کو دینے کا راستہ۔ اس کی نظر اور عقل دونوں ہی ٹھکنے لگیں۔

”مگر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ سوال ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ آیا۔

”اس لیے کہ شاید میں۔“ وہ کہتے کہتے جھجکا اور پھر رک گیا۔ ”شام ہو رہی ہے، چلو تم اب گھر جاؤ۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑنے ہوئے اسے کہا تھا۔

”اور ہاں یاد رکھو کہ بابا کی میرے نام جمع کرائی رقم میں سے مجھے مینے بھر میں تین ہزار روپے ملتے ہیں اور

ماما مجھے کبھی ایک ہزار کبھی پندرہ سو روپے پاکٹ منی دیتی ہیں لہذا اب اپنا ہاتھ روک کر رکھو کی تو تمہارا کام

بہی چلتا رہے گا اور میرا بھی۔“

چلتے چلتے اس نے اچانک رک کر کہا تھا ”اور پھر اپنی بائیک پر بیٹھا آگے“ آگے اور آگے بڑھ گیا تھا۔



رائیہ، ایک کی وال میں وہ کالا ٹکالے نکلی تھی جو اس کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ ڈیڑی کے چنگلی خوردو پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ جو ایک کے بیک سے باہر جھانک رہا تھا۔ رائیہ کے دل میں کھٹک بن کر اتر گیا تھا۔

”نہیں وہ یہاں کسی سے بھی خاص طور سے جا کر تو نہیں ملتا ہاں کالج سے نکل کر سیدھا گھر چلا جاتا ہے۔“ اسے پتا چلا تھا۔

”وہ کہاں سیدھا گھر چلا آتا ہے“ صالہ آنٹی کا بیان مختلف تھا۔ ”وہ تو شام ڈھلے گھر آتا ہے۔ پوچھوں تو کہتا ہے کہ کمپائن اسٹڈی میں مصروف تھا۔“

”آپ نے بھی اس سے پوچھا نہیں کہ کس کے ساتھ کمپائن اسٹڈی کر رہا تھا۔“ رائیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“ جواب میں وہ ہنس دی تھیں۔ ”کیا میں جانتی نہیں کہ ظفر اور معاذ

کے گھرانے امتحانوں کے لیے تم لوگوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔“

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
بیمادول	آمنہ دانش	500/-
درد و موم	راحہ جہیں	750/-
زندگی ایک دھڑکی	رضانہ گلارہ خان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رضانہ گلارہ خان	200/-
شہول کے دروازے	شازبہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازبہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر ہے	آبیہ سرزاق	450/-
آنکھوں کا شہر	فاخرہ افکار	500/-
بہول بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ افکار	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ افکار	250/-
یہ گلیاں یہ چہ پارے	فاخرہ افکار	300/-
میں سے گورت	غزلہ عزیز	200/-
دل اُسے لادھڑ لایا	آبیہ سرزاق	350/-
کھر تاجا نہیں خواب	آبیہ سرزاق	200/-
دھم کوئی سچائی سے	فوزیہ یاسین	250/-

ناول نگہا نے کے لئے کتاب ڈاک ٹراچ - 30 روپے

منکھو لئے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اور بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361



ہے۔ اور نگ زیب اس کا سوال سن کر یوں خوش ہوا  
تھا جیسے عرصے بعد کوئی کام کی بات اس کے ہاتھ لگی  
ہو۔ ”گاتا ہوں رضوان کو اس کے پیچھے تم فکر نہ کرو۔  
اس نے رانیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”دونوں میں  
پتا چلا لے گا ایک کی سرگرمیوں کا۔“

اور نگ زیب کو تو شاید کوئی مشغلہ ملنے والا تھا لیکن  
رانیہ اس کے اس انداز سے ڈر گئی تھی شاید اسے اس  
بات کا ذکر اور نگ زیب سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔



”ڈاکٹروں کے دیے سارے پرانے نسخے نکال کر  
کیوں بیٹھ جاتی ہیں۔“ سطوت نے اس روز گھر کی مکمل  
صفائی تھرائی کرنے کے بعد امی کو منایا تھا اور اب ان  
کے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔

”وہ جو آخری ایک نسخہ ہے، صرف اسی پر لکھی  
دوائیں منگوا لیا کریں نا۔ اتنی دوائیں منگوا لیتی ہیں بیٹن  
میں سے کھاتی کوئی بھی نہیں، جانے جا دیو ادوں پر لگی  
کیلوں پر فالتو دواؤں کے شاہرے لگے رہتے ہیں۔“

”نہیں موافق آتی کوئی بھی دوا تو کیا کروں۔“ وہ بے

زاری سے بولی تھیں۔ ”یہ میری ہڈیاں بھر بھری

ہو رہی ہیں اور جوڑ سب کے سب سوچ چکے ہیں۔ تم تو

کالج نکل جاتی ہو، میں سارے گھر میں چوپایوں کی طرح

چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتی پھرتی رہتی ہوں۔ کتنی بار

تم سے کہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں نیچے رکھ کر جایا

کرو۔ ذرا سی بھی اونچائی تک میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔“

”دوا موافق نہیں آتی تو سوچ سمجھ کر منگوا لیا کریں

نا۔“ سطوت کی سوٹی ابھی تک دواؤں پر اٹکی تھی۔

”جانتی بھی ہیں کہ کتنی مہنگی آتی ہیں دوائیں۔“

”تمہارے پلے سے نہیں خریدتی دوائیں، میرا

بھائی سلامت رہے جو مجھے دوا دارو کے لیے پیسے بھیجتا

ہے، وہ نہ بھیجے رقم تو اس گھر میں جو دال سبزی پکتی ہے،

وہ بھی نہ کئے، بڑی آتی مجھے مٹنے سے سستے کے سبق

سنانے والی۔“ وہ چلا کر بولی تھیں۔ کنگھی پر سطوت کی

گرفت کمزور پڑ گئی۔ امی کا یہ خواب ٹوٹنا نہیں

چاہیے۔

”ہائے“ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی وہ کیا کئے کیا نہ

کئے کہ امی کراہنے لگیں۔ ان کا سوچن زندہ ہاتھ اس کی

نظروں کے سامنے تھا۔

”لہس لہس اٹھتی ہیں، ہڈیوں میں اور سن ہو جاتی ہیں

انگلیوں کی پوریں، کندھے سے لے کر ہاتھ تک جیسے

چیز نیل دوڑنے لگتی ہیں جلد کے اندر۔ کمزوری

ہے، یہ سب کمزوری کی وجہ سے ہے، نہ کوئی خوراک

ہے میری نہ ہی طاقت والی دوائیں۔ بھئی چھوڑ

گوشت کی دویوٹیاں سبزی دال میں پڑی دیکھے جیسے گزر

گئے۔ تیری وجہ سے ہوا یہ سب۔ تیری وجہ سے۔“

انہوں نے سطوت کو دھموکا بڑا۔ ”فیس اور کتابوں پر

سارے پیسے اٹھا رہی ہے تو۔ اسی سے تو میرے

کھانے پینے کا سامان آجائے۔ بارڈالے گی تو مجھے یوں

ہی ایک دن بھوک پیاسی، کسکتی بلکتی۔“

سطوت نے ان کے بالوں میں بل ڈال کر جوتی کی

شکل دی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے انہیں گلاؤ

تیکے کے سارے لٹا دیا۔ کنگھی میں پانچے بالوں کو نکال

کر انگلی پر لپیٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا

چاہیے۔ امی کی خاطر کالج چھوڑ دے یا پھر ایک کے

اصرار پر جاری رکھے۔

”تمہاری امی نے اپنے چاؤ چو نچلوں میں تمہیں عمر

بھر کچھ نہیں دیا۔۔۔ اپنی محبت اور توجہ تک ابھی

نہیں۔ جب سے تم نے ہوش سنبھالا ہے، گھر کے

کاموں میں لگی رہی ہو یا نہیں۔ اسکول تو خیر تم نے اس

لیے بڑھ لیا کہ تمہارے ابا داخل کروا دیتے تھے تمہیں۔

باقی کیا کیا تمہاری امی نے تمہارے ساتھ۔ اسکول کالج

کی تعلیم چھوڑ کر انہوں نے تو تمہیں لازمی دینی تعلیم

بھی نہیں دلائی، جب ہی تو اسلامیات کی کتاب میں

درج ہر بات تمہارے لیے ہی ہوتی ہے۔“

وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بات کرنے کا عادی نہیں تھا

خواہ اس کی الفاظ سننے والے کے دل کے زخم اور بھی

گہرے کرتے جاتیں۔

”بس اسی لیے اب تم کالج نہیں چھوڑو گی۔“



جانتی ہوں اس کے سلیقوں کو۔ بستی بھر کو اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے اس نے دن رات سلام کرتے آتے ہیں اس کی چوکھٹ پر کام گھر بیٹھے ہو جاتے ہیں تو اسے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو میں ہی ہوں جسے ذرا ذرا سے کاموں کے لیے بندے بندے کی منتیں کرنی پڑتی ہیں۔“

”تمہاری اسی بات میں تو سارا راز چھپا ہوا ہے قمر آرا۔ کیوں تم میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو سب کو صالہ کی چوکھٹ پر سلام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جن کا نہ ہوتا۔ تمہیں دکان دکان پھر کر منتیں کرانا پڑتا ہے۔“ محمدی خالہ امی کے مزاج کی پردہ کیے بغیر کہتیں اور ابی بھج جاتیں۔ صالہ کا تعریف کے پیرائے میں ذکر انہیں اٹک لگا جاتا اور وہ میٹوں محمدی خالہ سے ناراض رہتیں۔

”نہ سطوت جو ہے نا اس کی امی۔“ اسکول میں سطوت کو دوسرے بچوں کی سرکوشیوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ ”میری اما کہہ رہی تھیں، سطوت کی امی اچھی عورت نہیں ہیں۔“ ”میرے بابا کہتے ہیں، سطوت کی امی تو ادا ہیں، مردوں سے تجھے تحائف ملتی ہیں۔“ سطوت سے دوستی نہیں کرنی بلوئی دوسرا کہتا۔

اور وہ اس دوسرے منہ پھٹ کی زبان کا شکار ہو کر کٹ کٹ جاتی لیکن سوائے زمین کے بھٹنے اور خود کے اس میں سہا جانے کی خواہش کرنے کے اپنے لیے کچھ کر نہ پاتی تھی۔

اس نے حمام کی ٹوٹی کھول کر اس سے ٹکلتے پانی کے نیچے برتن دھوتے ہوئے امی کی طرف دیکھا۔ اب جبکہ ان کی ہڈیاں اور جوڑان کا ساتھ چھوڑتے چلے جا رہے ہیں پھر بھی انہیں صرف اپنی فکر ہے۔ جبکہ سنا ہے جو ان بیٹیوں کی صحت مند ماؤں کو بھی صرف اپنی بیٹیوں کی فکر ہوتی ہے، خود اپنا آپ بھول جاتی ہیں۔ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگا اور پانی کا احساس کم ہونے لگا۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ یہ تعلیم تمہارا کتنا بڑا سہارا بننے والی ہے۔ جب کچھ نہیں ہو گا تو تمہارے پاس تب یہ تعلیم ہی تو ہوگی جو اندھیرے میں روشنی کی کرن بن جائے گی۔“

وہ سچ کہتا تھا۔ امی نے بچپن سے لے کر اس کی اس عمر تک اس سے صرف کام ہی کروائے تھے۔ کیسے کیسے دن آئے اور گزر گئے۔ طویل سہا کی طویل ترین راتیں اور سہو ترین دن، مہار اور گہرا کے دل خوش کن لگات۔ لمبی لمبی جھجڑوں والی برساتیں جب پورا پورا دن بارشیں برستی تھیں اور واوی کے تالوں میں۔ پانی کے تیزی سے چلنے اور طغیانی آجانے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ لیکن ان سب موسموں کے لطف سے نا آشنا وہ اسکول سے واپسی کے بعد، اس مختصر گھر کے ناختم بھٹنے والے کاموں میں جت جاتی اور امی ہار سنگھار کر کے گھر سے باہر نکل جاتیں۔ ان کو اپنی سیلیوں سے ملنے جانا ہوتا، گھر کا سودا سلف لینا ہو گیا اپنی ضرورت کی چیزیں اور گھر واپسی پر ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے لفافے ہوتے جن میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں اور امی کے تانے کپڑے اور سنگھار کا سامان بھرا ہوتا۔

”بچی چھوٹی ہے اور تم نے اس پر بوجھ زیادہ ڈال رکھا ہے۔“ امی کی پرانی سیلی محمدی خالہ تھیں جو اکثر اس پر ترس کھا کر امی کی توجہ اس کی طرف دلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ جب ہی تو یہ بڑھائی میں کمزور رہ گئی ہے اور تم اسے سپاہ پڑھنے کے لیے بھی میری طرف نہیں بھجیتیں۔“

”ایک میری جان ہے اور سو خیال جئے ہیں اس کے ساتھ۔“ امی چمک کر جواب دیتیں، میں گھر کے کام کرنے لگوں تو باہر کے کون کرے۔

”تم نے صالہ کو نہیں دیکھا۔ وہ بھی بیوہ ہو چکی ہے۔ تمہاری طرح بچے اس کے بھی چھوٹے ہیں۔ لیکن دیکھ لو، کیسے سلیقے سے سنبھل رکھا ہے اس نے سب کچھ۔“

”میرا منہ نہ کھلواؤ۔“ امی تلخی سے کہتیں۔ ”سب

نظروں سے نہیں بچا سکتا تھا۔  
”تم مجھ سے پوچھ سکتی تھیں، تم نے اورنگ زیب  
بھائی سے کیوں پوچھا؟“ وہ تصویر میں رائے سے مخاطب  
تھا۔



”کیونکہ یہ میرا محض ایک خیال تھا اور تمہیں  
بلادہ خیال ظاہر کرنے سے چڑھے، تم چاہیں لائی کو  
جیسے ٹھنڈ کرتے ہو ویسے ہی خود کو بھی کر کے لگتے۔“  
رائے کا انداز بے نیازانہ تھا، جیسے اسے توقع نہ ہو کہ  
ایک اس سے اتنا نامعقول سوال کرے گا۔

”وہ خیال نہیں، قیامت ہوتے ہیں، بے پر کے  
الزامات ہوتے ہیں جن سے مجھے چڑھ اور کیا میں  
جاننا نہیں کہ تم نے یہ خیال اورنگ زیب بھائی کے  
سامنے ہی کیوں ظاہر کیا۔ کسی اور سے بھی تو پوچھ سکتی  
تھیں تم۔ محاذ اور ظفر ہر وقت تمہارے ساتھ  
ہوتے ہیں اور سب سے ہنہ کر میں۔ ہر روز ہم ملے  
ہیں۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا؟“

”میں تم سے پوچھتی اور تم مجھے بتا دیتے۔“ رائے  
نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تم ہمارے سوال کرنے  
کا انتظار ہی تو کر رہے تھے۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”چھو تو تم بتا دو۔“ وہ ابڑوڑھا کر بولا تھا۔ ”میں کون  
سایا یا کام کر رہا ہوں جو تم لوگوں سے چھپاؤں گا۔“

”مجھے کیا پتا۔“ رائے نے بے ڈاری سے کہا۔  
”مجھے پتا ہوتا تو اورنگ زیب بھائی سے کیوں کہتی؟ ان  
سے بھی اس لیے کہا کہ تمہاری روئین میں آتی تبدیلی  
مجھے ابھاری تھی، ظفر اور محاذ کو نہیں۔ انہیں تو جیسے  
پروا بھی نہیں۔“

”اس لیے کہ انہیں دوستی کا وہ معاملہ یاد ہے جس  
کے مطابق ہم چاروں ایک دوسرے کے پرسنل میں  
داخل اندازی نہیں کریں گے۔ آئی ایم سوری رائے!  
پری نرمری سے لے کر اب تک لڑکوں کے ساتھ  
دوستی کرنے اور رکھنے کے باوجود تمہاری فطرت میں  
چھپی لڑکی زندہ رہی۔“ وہ تاسف کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”منا ہے تم اکثر ڈاک خانے والی سڑک پر آتے  
جاتے دکھائی دیتے ہو۔“ اورنگ زیب بھائی نے اس  
شام اچانک اس سے پوچھا تھا اور یہ بات پوچھنے کے  
لیے ان کی ناہنگ، مست و دست تھی۔ ملا کشیدہ کاری  
میں مصروف تھیں اور ان کا کپڑے سے سوئی نکالنا ہاتھ  
وہیں رک گیا تھا۔

”اسی لیے رضوان کا پوچھ رہے تھے کہ اس کا گھر ڈاک  
خانے والی سڑک کے آس پاس تو نہیں ہے۔“ اورنگ  
زیب بھائی کو مزا آرہا تھا۔ ایک نے ایک نظر اپنی  
طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ملا پڑائی اور پھر اورنگ  
زیب کی طرف دیکھنے لگا۔

”رضوان نے کیا کہا آپ سے۔“ وہ ان سے پوچھ  
رہا تھا۔

”اس کا ڈاک خانے والے راستے پر کیا کام بھلا؟“  
صالحہ نے اورنگ زیب کے جواب دینے سے پہلے  
حیرت سے کہا۔ ”دھڑ تو کوئی کم ہی جاتا آتا ہو گا۔ ایسا  
مستبان راستہ ہے وہ تو۔“

”پاکستان خان رشتہ ہو گیا ہے، کہیں تم نے اس کی  
جگہ ملازمت تو نہیں بیکری ڈاک خانے میں۔“ اورنگ  
زیب کے لہجے میں مسخر تھا اور چرے پر طنز۔

”آپ سے رضوان نے کیا کیا؟“ ایک نے اپنا  
سوال دہرایا۔

”رضوان سے تو میں نے کہا تھا پتا کرنے کو، مجھے  
رائے نے بتایا تھا کہ تمہاری روئین کچھ عجیب سی ہو گئی  
ہے۔ کرتے کیا ہو تم ادھر بانی داوے؟“ اورنگ زیب  
پوچھ رہا تھا، مسلسل سوال کر رہا تھا۔

”واقعی ایسا ہے تو بہت عجیب بات ہے ایک!  
تمہارا ادھر کیا کام، وقت ضائع کرنے لگے ہو تم۔“ کیا  
صالحہ کہہ رہی تھیں، ایک ان دونوں کے سوال اور  
انداز سن اور دیکھ نہیں رہا تھا۔ سامنے خلا میں دیکھتے  
ہوئے اس کا ذہن صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔ ”مجھے  
رائے نے بتایا تھا۔“

وہ کیوں بھول گیا تھا کہ جتنی احتیاط وہ کرتا تھا اس کی  
وجہ سے وہ بانی دنیا کی نظروں سے بچ بھی جاتا، رائے کی



”لیکن تم نے برا کیا۔ تم نے بہت برا کیا۔ اور تک زیب  
بھائی کے جسکے کوہو اپنے کا جرم کر بیٹھی ہو تم اور میں  
اس کے لیے جس میں معاف نہیں کروں گا۔“  
وہ جذباتی ہو رہا تھا اور افسردہ بھی۔ تیزی سے مڑ کر  
واپس چلنے سے پہلے اس نے ایک نگاہ بھی رائے پر  
ڈالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔  
”کیا ہوا؟“ ایک کیوں آیا تھا اتنی رات مئے اور بھی  
سے ملے بغیر چلا کیوں گیا؟“

رائے کی امی نے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھر کی  
طرف آئے والی روش پر آتے ہوئے بلند آواز میں اس  
سے پوچھا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ لائٹ پول  
کے نیچے آگلی کھڑی تھی۔ رائے نے نظر اٹھا کر اپنی ماں  
کی طرف دیکھا۔ وہ پشیمان تھی اور افسردہ بھی۔ وہ جلد  
بازی کر بیٹھی تھی۔ اسے محل سے کام لےنا چاہیے تھا۔

\*\*\*

”میں نے پتا کر لیا ہے۔“ اور تک زیب نے  
سرکوشی کے انداز میں صالہ سے کہا۔ ”معزت کا معاملہ  
ہے اس لیے رضوان سے نہیں کہا۔ اس بار میں نے  
خود پتا کیا ہے۔“  
”رات کے کھانے کے لیے قیہہ بھونٹی صالہ  
اس کی طرف مڑی تھیں۔

”وہ کوئی لڑکی ہے؟ پتا نہیں لڑکی ہے یا عورت؟ بڑی  
سی چادر میں چھپی ہوئی ہے اس کے ساتھ ایک  
کھنٹوں ڈاک خانے والے راستے پر بیٹھا رہتا ہے۔  
دراصل وہ اسی سے ملنے وہاں جاتا ہے۔“  
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ صالہ کو یقین نہیں آیا۔  
”ایک چوروں جیسے کام نہیں کرتا۔ غلط یا صحیح جو بھی  
کرتا ہے، مکمل کر اور سامنے آکر کرتا ہے، تم بھی اچھی  
طرح جانتے ہو۔“

”یہی تو ہوا ہے اس دفعہ۔“ اور تک زیب اسے  
اسرار کا رنگ دیتے ہوئے بولا۔ ”کوئی ایسی بات ہے  
جب ہی تو معاذ، ظفر اور رائے سے بھی چھپانا پھر رہا  
ہے۔“

صالہ کے چہرے کی رنگت لمحہ بھر کے لیے زرد  
پڑی، رائے نے بھی تو ان سے یہ ہی پوچھا تھا کہ کیا کسی  
ایک نے انہیں بتایا کہ وہ کس کے ساتھ کماٹن  
اسٹری کرتا ہے۔ اگر وہ معاذ، ظفر یا رائے میں سے کسی  
کے گھر بیٹھ کر پڑھتا تو رائے یہ سوال کیوں پوچھتی۔  
انہیں کسی انہونی کے ہونے کا احساس ہونے لگا۔  
انہوں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اور تک زیب کی  
طرف دیکھا۔

”اور مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ آپ کب سے تان  
چاچا کے اسٹور سے ادھار سودا منگوانے لگی ہیں۔  
ہمارے گھر میں پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔“ اور تک  
زیب اس دکان انہیں حیران بلکہ پریشان کر دینے کا تہیہ  
کر کے کیا تھا شاید۔  
”اے تم!“ وہ چونکیں۔ ”یہ تم سے کس نے کہا۔  
میں تو کبھی کسی دکان دار سے ایک کھٹنے کا بھی ادھار نہ  
کر لوں۔“

”کھٹنے دو کھٹنے کا نہیں مہینے بھر کا ادھار جو ایک چکا  
تے مہینہ پورا ہونے پر۔“ اور تک زیب کی آواز میں  
کھٹک پیدا ہو گئی۔ ”آج تو مڑا ہی آگیا تھا۔“  
”کیا الف لیلا سنا رہے ہو اور تک زیب۔“ صالہ  
الچہ گئیں۔ ”کیسا ادھار ہے جو ایک چکا آتا ہے۔ سوال  
ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی نے بے پر کی اڑائی ہے۔“  
”آپ خود پتا کر لیں بے شک۔“ میری اطلاع غلط  
ثابت ہوئی تو جو چور کی سزا وہی میری۔“

”اچھا اچھا کر لوں گی پتا۔“ انہوں نے اور تک زیب  
کو ٹالا تھا۔ ”لیکن ایک کے سامنے ذکر نہ کرنا ایسی کسی  
اطلاع کا؟ چڑ گیا تو گھر میں بے زاری پھیلے گی بے کار  
کی۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ اور  
یوں انہوں نے اور تک زیب کو تو خاموش کر دیا تھا  
لیکن اس ساری شام ان کی ابھی ہوئی نظریں بار بار  
ایک کے چہرے اور۔ انداز کو متعلق رہی تھیں۔  
کہاں کچھ معمول سے ہٹ کر تھا۔ جو انہیں علم نہ  
ہو پایا تھا۔ اور ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک صالہ کو سمجھ  
نہ پاتا اس کا اپنا تھا کھٹک چکا تھا۔ اور تک زیب اپنے



مزاج کے مطابق اپنا کام کر چکا تھا۔



رات بھر بارش مسلسل برسی رہی تھی اور دن چڑھنے کے ساتھ دوبارہ برسات شروع ہو گئی تھی۔

”نست جاؤ آج کل۔ مجھے بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے ڈر لگتا ہے۔ قمر آرانے اسے صبح صبح تانتا تیار کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

”اور مجھے میڈم صدیقہ کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔“ وہ لپے میں دودھ اور شہد ملاتے ہوئے بولی۔

”آج میں نے ٹیسٹ نہ دیا تو وہ اگلا پورا ہفتہ مجھے کلاس سے باہر کھڑا رکھیں گی۔ اس نے دلے کا پالہ ان کے سامنے رکھا۔

”تمیز اور سلیقہ تمہیں چھو کر نہیں گزرا۔“ قمر آرا جھلا کر بولیں۔ ”نست نہیں ہو تاکہ پیالے کے نیچے کوئی چھوٹی ٹرے یا پلیٹ ہی رکھ لو۔ گرے گا دودھ میرے ہاتھ کباب جاتے ہیں۔“

”تمیز اور سلیقہ مجھے کسی نے سکھایا ہی نہیں تو آئے گا کیسے۔“ وہ لاپرواہی سے بولی تھی۔ قمر آرا اٹھلا کر رہ گئی۔

”کہا تھا! خدا سخت ابلن دیا مجھے، وہ بھی نہیں ہوا تم سے۔“

”انڈے ختم ہو چکے ہیں اور تاج چاچا کیپاس سے ہماری طرف پورے پینس سو روپے کا راشن آچکا۔ اب مزید ادھار کی گنجائش نہیں۔“ اس نے اٹھ کر میبلے سے آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس آئینے میں اسے خود اپنی شکل دیکھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

”چارپانچ سواور بھی بن گئے تو کیا ہوا۔ میرا بھائی چھ سات ماہ تک جھجج دے گا، تم واپسی پر انڈے لیے بغیر آئیں تو دیکھنا۔“ قمر آرا خود ساختہ دنیا میں رہنے کی عادی ہو چکی تھیں۔

”اب تو آپ مہینے کے باقی دن اپنی تصوراتی مرغیوں کے انڈے ہی کھا لیں گی۔ تاج چاچا سے لانے کی تو

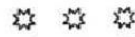
گنجائش باقی نہیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے صاف جواب دیا تھا اور کتابیں اور چھتری اٹھا کر کمرے باہر نکل آئی تھی۔ اسے ایک کے جب خرچ کی رقم اچھی طرح یاد تھی۔

لیکن خود اس کے لیے بھی وہ ایک ماہوس کن دن ثابت ہوا تھا۔ میڈم صدیقہ اس روز خود غیر حاضر تھیں۔ بارش کی وجہ سے بہت کم طالب علم کالج آئے تھے۔ سائنس بلاک میں بی ایس سی فائنل کی کلاس امتحان کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی اور اس کا سارا وقت آسمان سے گرتے بارش کے قطروں کو سمجھنے گزر گیا تھا۔

ڈاک خانے والا راستہ تاہوار تھا اور اس پر پچھلن بھی بہت تھی۔ مسلسل برستی بارش نے راستے کے کنارے بیٹھ کر بڑھنے کا موقع بھی کہاں دیا تھا، لیکن وہ پھر بھی کالج سے واپسی پر اسی راستے سے واپس آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی امید ایک سے آج کی ملاقات اور اس کے دوران ہونے والی گفتگو کی شکل میں چلی آرہی تھی، لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔

چندہ منٹ تک چھتری کے نیچے اس پتھر کے پاس کھڑے رہ کر انتظار کرنے کے باوجود وہ نہیں آیا تھا۔ سطوت کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ ایسا نہیں تھا ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ نہ آئے۔ بارش طوفان آندھی نے پہلے کبھی اس کا راستہ روکا تھا نہ آج روک سکتے تھے پھر وہ کیوں نہیں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آئے گا، اسے ڈانٹے گا وہ کیوں اس برستی بارش میں ادھر چلی آئی تھی اور پھر اسے اپنی بائیک پر پیچھے بٹھا کر برستی کی حدود تک چھوڑ دے گا ایسا پہلے بھی دو تین بار ہو چکا تھا، لیکن یقیناً وہ ایک مختلف اور ماہوس کن دن تھا۔

برستی بارش کے پانی میں تیز قدموں سے چلتی وہ ڈھلوان سے نیچے آرہی تھی۔ راستے بھر میں اسے کوئی دو سرازئی مریخ ملا تھا نہ ہی بستی کے بازاروں اور گلیوں میں کوئی ایسا نظر آیا تھا جس سے وہ پوچھ لیتی، ایک اس روز کہاں تھا۔



وہ اور نگ زیب کی بات بے بنیاد اور بے پرکی قرار

”میں جانتا ہوں۔ رائے نے اچھا نہیں کیا۔“ ظفر نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ اسے تمہارا معمول کی روشنی سے ہٹ جانا بہت کھل رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس روز مجھے یہیں اسی گیراج میں ہونے والی اس کی گفتگو سے ہو گیا تھا۔“

ایک اور ظفر، ظفر کے گھر کے باہر گھاس کے خالی قطعے پر بیٹھے تھے۔ بازو کمر سے پیچھے لے جا کر گھاس پر پھیلائے، ٹانگیں سیدھی کیے ایک سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آسمان پر ابھی بھی ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ دو سرا دن تھا جب وہ ڈاک خانے والے راستے کی طرف نہیں گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سطوت عین اس وقت اس راستے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ آسمان پر نظریں جمائے وہاں کیا دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

”محسوس تو ہیں اور معاذ بھی کر رہے تھے، لیکن بار! یہ تمہاری اپنی زندگی ہے۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو۔“ ظفر نے اپنے اور ایک کے درمیان چھائی خاموشی کو توڑنے کی خاطر کہا۔ ”رائے کو آپس کی بات کسی سے بھی نہیں کرنی چاہیے تھی، مجھ سے اور معاذ سے بھی نہیں۔ کیا اورنگ زیب بھائی۔ کیا ہم سب اورنگ زیب بھائی کے مزاج سے واقف نہیں۔“

”رائے ان کے مزاج سے واقف ہے۔ جب ہی تو اس نے صرف ان سے پوچھا۔“ ایک کی نظریں ابھی بھی آسمان پر جمی تھیں۔ ”اسے یقین تھا کہ اورنگ زیب بھائی بہت خوش لگ جائیں گے۔ اس لیے ان کا انتخاب کیا۔“

”اس نے برا کیا بہت برا۔“ ایک نے تاسف سے کہا۔ ”ظفر! مجھے لگ رہا تھا جیسے میں زندگی میں کوئی مقصد پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ رائے نے میری تمام تر کوشش خاک میں ملا ڈالی۔“ اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

”حق ہے رائے۔ نادان دوست، شاید وہ تم پر پانی سب سے زیادہ حق سمجھتی ہے اسی لیے جذباتی

وے چکی تھیں، لیکن وہ ایک انجانا سادہ رکھتا تھا جو ان کے دل کو لگ گیا تھا۔ تاج خان کے اسٹور کے کاؤنٹر پر کھلے رجسٹر میں درج جس کھاتہ دار کے نام پر تاج خان نے انگلی رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر ان کا منہ صبح معنوں میں کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

”یہ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ انہوں نے نظریں صفحے پر جمائے وحشت کے عالم میں تاج خان کو مخاطب کیا تھا۔

”ہاں بائی، یہ ہی وہ کھاتہ ہے جس کا حساب ایک چکانا ہے۔“ تاج خان مسکرا کر بولا تھا۔

”یہ تو قمر آرا کا کھاتہ ہے۔“ وہ جیسے خواب کی کیفیت میں بولی تھیں۔

”ہاں ہاں، وہی بائی قمر آرا کا کھاتہ۔“ تاج خان نے سر کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”بائی قمر آرا خود۔“ تاج خان سر پر رکھی کھٹائی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے کچھ بتاتے جا رہا تھا، لیکن صالہ کو مزید کچھ سننے کی حاجت تھی نہ ہی اس کی ضرورت پائی رہی تھی۔ بند سیاح چھاتے کا بیٹن کاٹتے ہاتھوں سے کھولتے ہوئے وہ اسٹور سے باہر نکل آئی تھیں۔ کبلی سڑک پر بارش کی بوندیں اب بھی برس رہی تھیں۔ نفاس میں ہلکے بادل دھنکی روٹی کی طرح اڑتے پھر رہے تھے، لیکن صالہ کے دل اور جسم کے اندر انگارے سے بھر گئے تھے۔

”بائی او بائی!“ پیچھے تاج خان اپنی بات پوری کر لینے کے لیے انہیں کو اس ہی دہرائہ گیا تھا۔

”کیا خانا!“ صالہ کے چلے جانے کے بعد جھاڑن والے ڈھٹے کو گھما کر کاؤنٹر پر رکھی چیزیں جھاڑتے ہوئے اس نے سر جھٹکا تھا۔ ”بات ہی پوری نہیں سنا صالہ بائی۔ ابھی تو ان کو بتانا تھا بائی قمر آرا ڈاکٹر منور کا دوا چھوڑ کر کسی حکیم کا دوا کھانے لگا ہے۔“

اور تاج خان کی پروا بہت سے آگے بہت آگے صالہ پیچ و تاب کھاتی گھر کی سمت چلتی چلی جا رہی تھیں۔





ہو گئی۔ اس نے رائے کی وکالت کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی۔

”اپنا حق جسکے کی خاطر وہ سروں کے خراب توڑنے کی کوشش کس ذمے میں آتی ہے؟“ ایک نے ظفر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”گناہ کے یا جرم کے؟“

”تم بھی جذباتی ہو رہے ہو اس وقت۔“ ظفر نے کہا۔ ”ایک عام سے معاملے کو ایسی انتہا پر لے جانا بھی تو جذباتی ہی کہلاتا ہے۔“

”تمہیں اندازہ نہیں ہے تاکہ رائے کے اٹھائے ایک عام سے معاملے کی وجہ سے کسی کا کیا نقصان ہوا ہے تمہیں اسی لیے اس کو اتلاٹ لے رہے ہو۔“

ایک اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنی پتلون سے جیکے گھاس کے ٹکڑوں کو جھاڑنے لگا۔ اسے ابھی اپنے گھر واپس جانا تھا۔

”اورنگ زیب نے نہ جانے کس رنگ میں ماما کو یہ خبر سنائی ہوگی۔“ یہ بات سوچ کر ہی اس کا دل گھر جانے سے ڈر رہا تھا۔



”اس بستی کے باقی سب مرد ختم ہو چکے تھے جو قمر آرا تم پر کل کے بچے پر ڈورے ڈالنے بیٹھ گئیں۔“ ایک جتنا بھی خوف ناگ قیافہ لگایا، مگر یہ بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صالحہ اس سارے معاملے کو یہ سن دیں گی۔

”مطلب، ماما، مطلب؟“ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ایسا جھٹکا کھانے کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

”مطلب تم نہیں جانتے ایک! صالحہ کے دل میں آگ لگی تھی۔ ان کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔“ مطلب میں جانتی ہوں۔“ وہ دانت چیر رہی تھیں۔ ”تم تو ابھی چھوٹے ہو، نا تجربہ کار اور لا ایللی۔“

قمر آرا تو بڑے بڑے بچوں کے ہوش اڑا دینے کا فن جانتی ہے۔ اور میرے خدا! انہوں نے اپنا سروہ نول ہاتھوں سے

تھام لیا۔ ایک دم بخود بیٹھا، صالحہ کو بولنے تھماتے، کوٹنے اور صلواتیں سناتے دیکھ اور سن رہا تھا۔ صالحہ، قمر آرا کے ماضی کے الیم میں جھانکتی ایک ایسی ناہیدہ کچڑ میں چھری چلا رہی تھیں جس سے اڑتے بچڑ کے سب چھینٹے ایک کو اپنے بے داغ کردار پر بڑے محسوس ہو رہے تھے۔

”اس کی ہڈیوں میں ابھی بھی انتقام دم خیم ہے کہ وہ ڈاک خانے والے دشوار اور ناہموار راستے پر تم سے ملاقاتیں کرنے پہنچ جاتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس راستے کا انتخاب بھی اسی نے کیا ہوگا، وہی جانتی ہے کہ اس طرف کبھی کوئی جاتا آتا ہے۔“ ایک کا سر جھکا رہا تھا۔ اس نے صالحہ پیش بھرے لیے اور دشت زدہ چہرے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا تھا۔

”ساری زندگی وہ سروں کی جینیں خالی کر کر اپنا گھر بھرتے عمر گزار گئی اس کی تب کوئی تجربہ کار پشور مرغا پھسلنے کی عمر تو رہی نہیں، تو اس نے تمہیں پھنسا لیا۔ کتنی رقم خرچ کر چکے ہو ابھی تک اس پر تباؤ تو ذرا۔۔۔ تاج خان کے چھٹلے کھاتے جو تم نے کالے کیے، وہ تو میں آج دیکھ آئی اور گیا اور کتنا لاپچھے ہو اس پر تباؤ تو ذرا۔“ صالحہ چلا رہی تھیں۔

”غضب خدا کا!“ انہوں نے ایک کی مسلسل خاموشی سے باؤس ہو کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ ”میں اس سے کتنی رہی، نئے کپڑے خرید لو، تمہارے سوٹر رانے ہو چکے، جو توں کی سلاخیاں نکل گئیں، پار پار مرمت کروا دے، ہو بہتر نہیں کہ جو توں کی نئی جوڑی خرید لو، موٹر سائیکل خراب ہے، ایک دن لگا کر اس کو ٹھیک کروالو۔ مگر میری اس نے ایک نہیں سنی سنتا بھی کہاں۔ اس پر تو اس یقینی کا عشق سوار تھا۔ اپنی جیب سے نکال کر اس پر لٹا تا رہا اور مجھ اندھی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔“

اورنگ زیب کا دل ملیں اچھلنے لگا۔ اگلے کئی ہفتوں تک کے لیے اسے موضوع مل گیا تھا۔ جس کو لے



مگر میں جی بن کر رہ گئی، وہ تو اور ڈھنگ سے۔ اور نگ زیب کہہ رہا تھا۔ ”سنا ہے کالج میں بھی اس کے گریڈز اوپر ترقی سے نیچے ہی رہتے ہیں، رضوان بتا رہا تھا۔“ ایک کی سماعت اور نگ زیب کے اعترافات کی حد سے باہر چلی گئی تھی۔

\*\*\*

”سیرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا۔“ رائے وہاں ہی ہو رہی تھی۔ اس روز ظفر اور معاذ نے اسے آڑے ہاتھوں لے رکھا تھا۔ ایک چار کے اس گروپ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر چکا تھا اور دوستی کے مضبوط پرانے رشتے میں ایک ایسی دراڑ پڑتی نظر آ رہی تھی جس کو نہ جانے کبھی بھرا بھی تھا یا نہیں۔ ”میں نے سنا تھا کہ لڑکیوں کی اگر دوسروں کے معاملات میں بے وجہ کی دیکھی لینے کی عادت ختم ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہیں۔“ معاذ دھک سے کہہ رہا تھا۔

”سارا قصور اور نگ زیب بھائی کا ہے، میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنا بدانتہا ثابت ہوں گے۔“ رائے نے اپنی صفائی دینے کی کمرور کوشش کی۔ ”تم جانتی تھیں اور اچھی طرح جانتی تھیں۔“ معاذ نے دانت پیسے۔ ”قصہ صرف اتنا ہے کہ تم ایک کو اپنی زمین سمجھتی تھیں اور تمہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ وہ اس زمین پر کسی اور کے لیے پھول کاشت کرنے لگا تھا۔ بس اتنی ہی سی بات ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ رائے کے پاس اپنے دفاع کے لیے الفاظ نہیں تھے۔

”تم نے ایک کو ہرٹ کیا ہے رائے! تمہاری وجہ سے ہم دونوں بھی اس سے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔“ ظفر ایوس سے بولا۔ ”جس دوستی کی مثال سب دیتے تھے اس کو تمہارے تجسس کے ناگ نے ڈس لیا ہے۔ اس نے کسی سے بھی بات تک کرنی چھوڑ دی ہے۔“

”میں نہیں جانتا اور نگ زیب بھائی اور صالحہ آئی

— کر اس معاملے کو ماما سے ڈسکس کرے گا اور اپنی مہم چلے بھی۔ اسے تو آج رات ہی یہ ساری اسٹوری سنائی تھی۔ کتنا مزا آئے گا اس کو۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔

”دس سال پہلے بھی اس نے تمہاری ہی عمر کے جمال کو چھنایا تھا۔ اس کا اپنا کوئی بیٹا ہوتا تو اسی عمر کا ہوتا جتنا جمال تھا۔ کرٹل حبیب اللہ کا بیٹا یا وہ ہے نا؟“ انہوں نے ایک بار پھر اور نگ زیب کی طرف دیکھا۔ ”یاد ہے ماما! میں نے ہی تو سب سے پہلے آپ کو بتایا تھا۔“ اور نگ زیب کو ایسی باتیں کہاں بھول سکتی تھیں۔

”کیا کیا جتن کر کے کرٹل صاحب نے اپنی پوسٹنگ یہاں سے کروائی تھی۔ بچہ ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا، کیا کرتے بے چارے، اس وقت بھی سب لوگوں نے اہت بھیجی تھی اس قمر آرا پر۔ مگر بھال ہے جو اتنی سی بھی شرمندہ ہو جائے۔“ صالحہ نے ایک کی طرف دیکھا، جسے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

”ب مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش کیوں بیٹھے ہو بیولتے کیوں نہیں؟ کیسے بولو گے، تمہارا راز تو چور ہے میں پھونٹنے والی ہانڈی کی طرح کھل گیا۔ جانتی ہوں میں، ہو شیاریوں اور چالاکیوں کے سارے سبق تمہیں پڑھا چکی ہوگی تمہیں وہ قمر آرا۔ مگر وہ بھی بھول گئی اور تم بھی بھول گئے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ نیت کی صاف اور اللہ رسول کی غلام عورت کے بیٹے۔ مجھ سے تمہارا یہ راز کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔“

گھرے میں شدید ٹھٹھن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ایک کو لگا اس کا سانس بند ہو رہا ہے، وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”استغفار! استغفار۔ اس دد زنی عورت کو اپنی جوان بیٹی تک کا بھی خیال نہیں جسے سارا دن گدھوں کی طرح گھر کے کاموں میں جوتے رکھتی ہے۔“ گھرے سے باہر نکلتے ہوئے صالحہ کے الفاظ اس کے کانوں سے گھرائے۔

”وہ بے چاری تو گدھوں کی طرح کام کرتے کرتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ اس نے غلت میں پائیک کو کنگ ماری تھی اور پائیک باریک سے نکال کر کالج کے گیٹ کی طرف لے گئی تھی۔

”یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے۔ اسے ایک کی دوستی میسر ہے اور جسے ایک کے ساتھ اٹھنے، بیٹھنے، گھومنے، پھرنے اور باتیں کرنے کے لیے ڈاک خانے والا راستہ نہیں اپنانا پڑتا۔ یہ کھلے عام اس کے ساتھ گھومتی، خوش گپیاں کرتی نظر آتی ہے اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔“ سطوت کو رائے پر رشک آنے لگا۔

”یہ گزرے کل میں بھی ایک کے ساتھ تھی اور آنے والے کل میں بھی اس کے ساتھ ہوگی۔ دونوں ایک سے مضمون جو پڑھتے ہیں۔“

\*\*\*

رائے اسے چوہان لائی کے آفس میں بیٹھے فاسٹل ڈسکشن کرتے چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ کھٹے دو کھٹے سے پہلے اٹھنے والا نہیں تھا۔

ایک کے گھر کے احاطے میں داخل ہو کر پائیک بیڑھیوں کے نیچے کھڑی کر کے وہ صالہ آئی تک پہنچنے کے لیے تیزی سے بیڑھیاں چڑھنا چاہتی تھی، لیکن چار ہی بیڑھیاں چڑھنے پر لکڑی کی بیڑھیوں کے سبز رنگ سے لگتے ایک لفافے نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے جھک کر لفافے کو ہاتھ لگایا، وہ چنگ کی ڈور کی مدد سے رنگ کے ساتھ بندھا تھا۔

رائے نے تیزی سے لفافے میں ہاتھ چلایا۔ لفافہ کاغذ کی چھوٹی چھوٹی ان گنت کتروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایسی کتروں تھیں جو کسی نازک چیز کی پینٹنگ میں اسے دباؤ سے بچانے کے لیے بھری جاتی تھیں۔ رائے نے لفافے کو ہاتھ میں لیا اور لاشعوری طور پر کندھے سے لٹکتے بیگ میں اڑس لیا۔ ”واپسی پر سڑک کنارے لگے کوڑا دان میں ڈال جاؤں گی۔“ اس نے سوچا تھا۔

صالہ آئی سے اس روز کی ملاقات سے اس کے اندر کا جرم کا احساس کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ صالہ آئی اس بات کو تو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہی تھیں

نے اسے کیا کہا ہے؟“ معاذ نے سر ہلایا۔ ”لیکن جو بھی کہا ہے، وہ اس کے لیے ناقابل برواقت ہے، میں نے آج تک کبھی اسے اتنا خاموش اور افسردہ نہیں دیکھا۔ بتاؤ اب تم اس سارے کی تلافی کیسے کرو گی۔“

”میں۔ میں صالہ آئی سے خودیات کروں گی، میں انہیں بتاؤں گی، وہ ایک غلط فہمی تھی۔ مجھے دوستی کا بھرم رکھنا آتا ہے، یقین کرو۔“ رائے نے بے ربط الفاظ میں بات کرنے کی کوشش کی۔

”کسی ایسے وقت میں اس کے گھر مت چلی جانا“ جب وہ گھر موجود ہو۔ اسے اور بھی برا لگے گا اور شاید جہیں بھی اچھا نہ لگے۔“ ظفر اسے سمجھا رہا تھا۔

\*\*\*

کالج کے ایڈمن آفس سے فاسٹل امتحان کے لیے رول نمبر منسلک مل رہی تھیں۔ اس روز بی ایس سی فاسٹل ایر کے اسٹوڈنٹس کی کالج آمد کی وجہ سے خاصی گھبراہٹ تھی۔ سطوت نے ایڈمن آفس کے کوریدور میں اکیلے کھڑے ایک کو دیکھا، وہ لوٹس بورڈ پر لگی ڈیٹ شیٹ دیکھ رہا تھا۔

پچھلے کئی روز سے وہ ڈاک خانے والے راستے پر نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا، کوئی مسئلہ تھا، پریشانی تھی یا پھر اس کا دل اس معمول سے اچھٹ ہو گیا تھا۔ سطوت کا دل چاہا کہ اسے کچھ تو بتائے، اسی امید پر کہ وہ سطوت پر نظر رہ جائے، پر اس کی طرف آنے کا اس نے وہیں کھڑے کھڑے ارادہ لازی کا پیر پیر چھوڑ دیا تھا، لیکن پندرہ منٹ بعد وہ اس کی سمت آنے کے بجائے دوسری طرف مڑ گیا تھا۔

سطوت نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو تھوڑی دیر کے لیے بند کیا اور پھر گھاس کے قطعے پر رکھے سنگی بیچ پر بیٹھ گئی۔ وہ اتنے روز شاید خواب دیکھ رہی تھی، شاید اس روز اس کی آنکھ بستوں بعد کھلی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ ایک کی بہترین دوست رائے باریک لاث میں کھڑی سر پر رکھے ہیلمٹ کا قلم تھوڑی پر تیزی سے چڑھا کر اپنی پائیک پر بیٹھ گئی



جو رائے نے اورنگ زیب سے کسی تھی، ایک سے ناراضی کی ان کے پاس اپنی وجہ تھی اور بقول ان کے وہ ان کے گھر کا معاملہ تھا۔ رائے کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”تم تو دوست ہو اس کی، وہ بھی قریبی اور پرانی، ایک کا رویہ بدلے گا تو تم توجہ دلو گی ہی۔“ صالحہ آنٹی نرم لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”کوئی مسئلہ کچھ اور تھا۔“ واپسی کے لیے بیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ”وہ بلا وجہ ہی دل گیر ہوئی۔ لیکن پھر ایک مجھ سے کیوں منہ پھلائے پھر رہا ہے اور چار کے گروپ سے خود کو علیحدہ کر لینے کی کیا وجہ ہے۔“ پھر اس کا ذہن ایک نئے نقطہ پر اٹک گیا اور اسی نقطہ پر سوچتے ہوئے وہ کانڈ کی کتڑوں والا لفافہ سڑک کنارے لگے کوڑاؤں میں ڈالنا بھول گئی۔

\*\*\*

”وہ یقیناً“ خواب ہی تھا۔“ جنگلی ڈیریز کے مرمجائے ہوئے پھولوں کو اسلامیات اختیاری کی کتب میں رکھتے ہوئے سطوت نے بالآخر پندرہویں روز بارمانتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا۔

نہ تو کوئی ڈاک خانے والے راستے پر آتا تھا نہ ہی تاج چاچا کے اسٹور پر حساب چکاتا تھا۔ لوگ ٹھیک کہتے تھے مسلسل تنہائی اور مشکلات سے انسان طرح طرح کے ادھام میں پڑ جاتا ہے۔ سطوت کے ایسے ہی ایک وہم کا نام ایک تھا اور اب اسے باقی کی بوری زندگی اس وہم کے فسوں سے خود کو نکالنے کی کوشش کرنا تھی۔

دن گزرتے اور موسم بدلتے چلے جا رہے تھے۔ بی ایس سی فائنل کے امتحان آئے اور ہو کر ختم بھی ہو گئے ظفر اور معاذ انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور رائے ایک ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ چاروں ایک بار پھر کہیں اکٹھے مل بیٹھ سکیں۔ غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی گرد کا صاف ہونا بہت ضروری تھا، مگر وہ ایک تھا

جس نے صالحہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور بدگمانی کے نتیجے میں خود پر پڑنے والے کچھ کے چھینٹوں کو صاف کرنے کی ایک بار بھی کوشش نہیں کی تھی۔

اس نے صالحہ کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا تھا، بس خود میں گم مسم ہو کر رہ گیا تھا۔ صالحہ کے پاس اب اس کی خبر لانے کو اورنگ زیب اور رضوان کے علاوہ اور اعتبار والے چند لوگ تھے اور انہیں ہر جگہ سے یہ ہی رپورٹ ملتی تھی کہ ایک نہ ڈاک خانے والے راستے پر دیکھا گیا نہ ہی کبھی تاج خان کے اسٹور کے قریب سے گزرا تھا۔ قمر آرا کے کھاتے میں قمر آرا کی طرف ادھار روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا اور ایک دن جلد ہی ایسا بھی آئے والا تھا جب تاج خان نے قمر آرا کو مزید ادھار سودا دینے سے انکار کر دیا تھا۔

صالحہ کو اطمینان ہونے لگا تھا۔ ایک ایسے کرے میں گھسا پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے امتحان کے دوران ہی وہ جرمنی میں رہنے والے اپنے چچا زاد بھائی سے ایک کے مستقبل کے بارے میں معاملات طے کر چکی تھیں۔ انہوں نے اس سے بات بھی کر لی تھی، اسے جرمنی جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ان کے نا تجربہ کار، بے ضرر اور معصوم بیٹے کے لیے بس اتنی ہی ڈونڈ کافی تھی۔

\*\*\*

ظفر کے گھر کے گمراہ میں دوبار سے ٹیک لگائے وہ نیچے فرش پر بیٹھا تھا۔ گمراہ میں روشن کم طاقت کے انرجی سیور کی روشنی اس کے چہرے کے خدوخال کو واضح کرنے کے لیے ناکافی تھی، لیکن اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھا معاذ دیکھ سکتا تھا کہ وہ اداس تھا اور دیکھی بھی۔

”تم نے غلط کیا ابھی۔ تمہیں صالحہ آنٹی کو سب بچ بچ بتانا چاہیے تھا۔“

”کیوں بتانا؟“ اس نے گردن موڑ کر معاذ کی طرف دیکھا۔ ”انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی کب وہ تو کنفرنڈ تھیں کہ ادھر ادھر سے سن کر وہ جو سوچ رہی



تھیں وہ بالکل ٹھیک تھا۔“  
 ”غلط نہیں تو پیدائشی طور پر کیے جانے کے لیے ہوتی ہیں یا راہ بھی ماں اور بیٹے کے درمیان آگنی کی غلط فہمی دور کرنے میں تمہیں کیا مسئلہ تھا۔“ ظفر کا سایہ گیلان کے اندر آکر ان دونوں پر پڑنے لگا۔

”اگر وہ مجھے زندگی کے ان بائیس سالوں میں ڈھنگ سے نہیں جان پائیں تو کیا ان چند لمحوں میں جان جاتیں۔“ وہ سانسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بہتر ہوتا اگر خود بروہ کھایا اور ناقابل برداشت الزام سننے سے پہلے میں مر جا سک۔“

”الزام تو انہوں نے قمر آرا پر لگایا تھا یا راہ تم پر تو نہیں۔“ ظفر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔  
 ”وہ بھی قمر آرا کے ماضی کے کارناموں کی وجہ سے“  
 ”تھیں تو وہ معصوم سمجھتی ہیں شاید۔“

”پر کمائی اتنی شدید ہو جائے کہ آنکھوں پر پی پانڈھ دے، انسان کو بصارت سے محروم کر دے اور وہ اپنے سامنے اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارے ہوئے چھڑیوں کو اپنی مرضی کی شکل دینے لگے تو ایسے شخص کو چھڑیوں کی اصل شکل بھائی نہیں جاسکتی۔ قمر آرا کا ماضی کیا تھا، اگر ہم بغیر اس کا حال دیکھیں اسے صرف ماضی کی نظر سے دیکھتے رہیں گے تو پھر تو وہ ہمیشہ کے لیے مطعون ہی ٹھہرے گی تا۔“ ایک جیسے نیند میں پل رہا تھا۔  
 ”کوہا تم قمر آرا کو بھی ویسا نہیں سمجھتے جیسی وہ مشہور ہیں۔“ ظفر حیرت سے بولا۔

”میں قمر آرا کی وکالت نہیں کر رہا، مجھے ملا سے ایسی تنگ نظری اور بد کمائی کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بھی وضاحت لیے بغیر قمر آرا پر الزام دھروا۔ ماما خود کو اعلا طرف سمجھتی ہیں، مگر درحقیقت ان کا ظرف بلند نہیں ہے۔“

”تم صالحہ آگنی کو ۱۲ مار جردین لائف“ فریم میں جڑا ایک ایچ ایچ سمجھتے ہو ایک! جب کہ کوئی بھی انسان اتنا پرفیکٹ نہیں ہوتا ذاتی تعصبات ہر کسی کے ساتھ نہتے ہوتے ہیں۔“ ظفر اسے وہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ سمجھتا جا رہا تھا۔

”ماما نے میری نظر میں اپنے ایچ کو بیٹھ کے لیے لیٹ ڈاؤن کر دیا ہے، لیکن وہ میری ماں ہیں، میں انہیں لیٹ ڈاؤن نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ جو توقع مجھ سے رکھتی ہیں میں اس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

”قرار حاصل کر رہے ہو یہاں سے، ہے نا!“ معاذ نے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی۔  
 ”تم نے اسے بھی کچھ بتایا ہے کہ ہو کیا رہا ہے جس کی وجہ سے تھوڑے سے دنوں میں حالات کا نقشہ بدل گیا۔“

”اسے سوچنے اور سوچ کر سمجھنے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ آگنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”وہ ہر طرح کے حالات کی عادی ہو جانے کی غیر معمولی صلاحیت کی مالک ہے۔ میں اسے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

ظفر اور معاذ نے کم روشنی میں دیوار پر بڑے ایک دوسرے کے سائے کی طرف دیکھا۔ وہ جس ایک کو ہمیشہ سے جانتے تھے وہ فیصلہ کر لینے کے بعد اسے بدل دینے کا عادی نہیں تھا، وہ دونوں جان گئے تھے کہ اس معاملے پر ایک کو جتنا ان دونوں کے سامنے حال دل سنانا تھا، وہ سنا چکا تھا۔ اس سے آگے وہ ایک لفظ بھی نہیں بولنے والا تھا۔

”یہ تمہارے لان میں آگ کیوں روشن ہے؟“ ایک نے گیران کے اٹھے ہوئے شمر کے عین نیچے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”صرف آگ نہیں، یہ وہ سالانہ بون فائر ہے جو ہم سال کے اس حصے میں مناتے ہیں۔ آج تمہارے لیے خصوصی بون فائر کا اہتمام کیا ہے میں نے۔“ ظفر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ایک اور معاذ بھی ظفر کے پیچھے چلتے لان میں آگے روشن آگ کے قریب رائیہ کھڑی اس میں خشک ٹہنیاں اور پتے جھونک رہی تھی۔ آگ کی روشنی میں ایک اور رائیہ کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملیں، رائیہ کی نظروں میں افسردگی تھی اور ایک التجا بھی۔

”میں جذباتی ہوں اور ضرورت سے زیادہ بول جائے والا شخص بھی ہوں۔“ ایک نے اگ کے اس الاؤ کے قریب پیچھے ہوئے رائے سے کہا۔

”میرا لیٹن کروف میرا مقصد وہ نہیں تھا جو ہو گیا۔“ رائے کے لہجے میں غمزوں کی سی شرمندگی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”واقعات کو روکنا ہونے کے لیے وجوہات چاہیے ہوتی ہیں۔ تمہارا تجسس میرے گھر والوں کی نظروں میں مجھے منہ کے بل کرانے کی وجہ بن گیا۔“ اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے۔“

”میں نے صاف آنٹی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ رائے کے لہجے میں ایک سے زیادہ شکستیں تھیں۔

”اور وہ نہیں مانی ہوں گی۔“ ایک کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔ ”ان کو ماننا بھی نہیں چاہیے تھا“

تعب کی عینک سے چیزوں کا منظر ویسا ہی نظر آتا ہے جو ہم نے سوچ لیا ہوتا ہے۔ مجھے ماما سے بھی کوئی گلہ نہیں۔“ الفاظ اس کے حلق میں اگلنے لگے تھے۔

”کم آن بچو۔“ معاذ نے نالی بجاتے ہوئے ان تینوں کو اسی طرح مخاطب کیا جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

”آج کی رات آخری رات ہے کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جائے والی ہے۔“

ہر سال یون فائر کے دوران اس قسم کے اعلان کرنا بھی معاذ کی عادت تھی، مگر یہ پہلا موقع تھا جب ان چاروں میں سے ہر کوئی جانتا تھا کہ آنے والے کل میں واقعی دنیا بدل جائے گی۔

”ایک جرمی جا رہا ہے۔ مجھے اور ظفر کو اسلام آباد میں ایڈیشن مل چکا ہے۔ اور رائے تمہیں“ معاذ نے رائے کی طرف دیکھا۔ ”تم اپنے پیار میں کے ساتھ لاہور جا رہی ہو کیونکہ تمہارے ڈیڑی نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں نے کہا تھا آج کی رات آخری رات ہے۔ کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جائے والی ہے۔“

”لیکن کچھ لوگ ہیں جن کے لیے ہر دن کا نیا

سورج کبھی بھی اپنے ساتھ کچھ نہ لے کر نہیں آتا۔“ معاذ نے قریب بکھری چھوٹی چھوٹی خشک مٹنیاں اور جھاڑ جھکاڑ روشن الاؤ میں بھینکتے ہوئے کہا۔

”وہ ایک سی زندگی گزارے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک دن دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“ وہ ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ بنا رہا تھا۔

”اور ایسے ہی چند لوگ میرا غم ہیں۔“ معاذ نے لفظ کا اگلا حصہ بتایا۔

”ایسے ہی چند لوگوں کے لیے میں جینا چاہتا تھا۔“ ظفر روشن الاؤ پر نظریں جمائے بولا۔

”لیکن مجھ کو جینے نہیں دیا گیا۔“ ایک نے ہاتھ میں پکڑا آخری خشک چمراتا پتہ اگ میں اچھالا۔



ہمارے بعد برسات گزری اور دلدلی میں ایک بار پھر سرما کا موسم اترنے لگا تھا۔ قمر آرا کے جسم کے جوڑ کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جا رہے تھے اور بیاں ہر روز پہلے سے زیادہ بھر پوری اور نرم۔ سہا کے ہاتھ پر کپڑے بدلتے ہوئے ان کے کندھے کا جوڑ اتر گیا اور ریشہ کی ہڈی کا ایک مہو بھی اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ سطوت نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

پشاور سے قمر آرا کا بڑا بھائی ایک رات کے لیے آیا تھا۔ وہ مصر تھا کہ قمر آرا اور سطوت اس کے ساتھ پشاور چلی جائیں۔ وہاں قمر آرا کا بہتر علاج ہو سکتا تھا، مگر قمر آرا وہ جگہ چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھیں، مایوس ہو کر سطوت کے ماموں نے کچھ رقم قمر آرا کے اکاؤنٹ میں ڈلوائی اور واپس چلا گیا۔

ماموں کی دی ہوئی رقم سے چند مہینے علاج معالجے اور خوراک کے ساتھ نکل گئے اور اس کے بعد گھر میں ایک بار پھر فاقوں نے ڈیر اڑال لیا۔

”ہاتھ پیر ملانے پڑیں گے، آسمانوں سے من و سلوی کوئی بھی اس گھر میں نہیں آتا رہے گا۔“ قمر آرا کا سارا دن بیچ بیچ کر سطوت کو اکسلنے میں گزر جاتا اور

”میں جذباتی ہوں اور ضرورت سے زیادہ بول جائے والا شخص بھی ہوں۔“ ایک نے اگ کے اس الاؤ کے قریب پیچھے ہوئے رائے سے کہا۔

”میرا لیٹن کروف میرا مقصد وہ نہیں تھا جو ہو گیا۔“ رائے کے لہجے میں غمزوں کی سی شرمندگی تھی۔

”ہو سکتا ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”واقعات کو روکنا ہونے کے لیے وجوہات چاہیے ہوتی ہیں۔ تمہارا تجسس میرے گھر والوں کی نظروں میں مجھے منہ کے بل کرانے کی وجہ بن گیا۔“ اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہو جاتا ہے۔“

”میں نے صاف آنٹی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ رائے کے لہجے میں ایک سے زیادہ شکستیں تھیں۔

”اور وہ نہیں مانی ہوں گی۔“ ایک کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔ ”ان کو ماننا بھی نہیں چاہیے تھا“

تعب کی عینک سے چیزوں کا منظر ویسا ہی نظر آتا ہے جو ہم نے سوچ لیا ہوتا ہے۔ مجھے ماما سے بھی کوئی گلہ نہیں۔“ الفاظ اس کے حلق میں اگلنے لگے تھے۔

”کم آن بچو۔“ معاذ نے نالی بجاتے ہوئے ان تینوں کو اسی طرح مخاطب کیا جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا۔

”آج کی رات آخری رات ہے کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جائے والی ہے۔“

ہر سال یون فائر کے دوران اس قسم کے اعلان کرنا بھی معاذ کی عادت تھی، مگر یہ پہلا موقع تھا جب ان چاروں میں سے ہر کوئی جانتا تھا کہ آنے والے کل میں واقعی دنیا بدل جائے گی۔

”ایک جرمی جا رہا ہے۔ مجھے اور ظفر کو اسلام آباد میں ایڈیشن مل چکا ہے۔ اور رائے تمہیں“ معاذ نے رائے کی طرف دیکھا۔ ”تم اپنے پیار میں کے ساتھ لاہور جا رہی ہو کیونکہ تمہارے ڈیڑی نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں نے کہا تھا آج کی رات آخری رات ہے۔ کل صبح طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ دنیا بدل جائے والی ہے۔“

”لیکن کچھ لوگ ہیں جن کے لیے ہر دن کا نیا



قمر آرا کو دیکھتے: ”عمر بھر مر کر پاس ہونے والی ایک لڑکی کو اس بستی کا کون سا استاد نہیں جانتا ہو گا۔ مجھے کون دے گا تو کری۔“

لیکن پھر ایک دن محمدی خالہ اسے زبردستی بھینٹ کر اپنے ساتھ لے ہی گئیں۔ بستی کے عام لوگ اپنی بچیوں کو نوکری کی اجازت نہیں دے رہے تھے اور اسکول کھولنے والوں کو ٹیچرز کی فوری ضرورت تھی سو سطوت کو ہاتھوں ہاتھ اسکول میں نوکری مل گئی تھی۔



”سنا ہے“ اورنگ زیب نے آتش دان میں جلتی آگ پر ہاتھ سینکنے کے بعد انہیں آپس میں رگڑتے ہوئے بات شروع کی۔ صالحہ نے کشیدہ کاری کے فریم سے نظر اٹھا کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

”لو اب یہ کچھ نئی سن آیا۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔

”وہ جو جانے سے پہلے ایک نے بتایا تھا کہ وہ اپنا کپیوٹر کتابیں اور سی ڈی، کسی جو نیوٹر طالب علم کو دے آیا تھا“ وہ اس نے کالج کے کسی بچے کو نہیں دی تھیں۔“

”اچھا تو پھر کسے دے دیں؟“ صالحہ کو اورنگ زیب کی یہ نئی کہانی ذرا بھی دلچسپ نہیں لگی تھی۔

”یہ تو پتا نہیں۔“ اورنگ زیب نے سر ہلایا۔ ”لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کہیں انہیں بیچ کر رقم چچی قمر آرا کو نہ دے گیا ہو۔“

”حد کرتے ہو تم بھی اورنگ زیب!“ صالحہ نے فریم صوفے پر بیٹھ دیا۔ ”ایک بار علم ہو جانے پر میں نے بازی طرح اس پر نظر رکھی، وہ کب قمر آرا سے مل سکا ہو گا اور کہاں۔“ یہاں بچے گھر میں؟“

اورنگ زیب نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر وہاں ڈاک خالے والے راستے پر؟“ انہوں نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمنی فرصت میں نے اسے ملنے دی تھی کیا؟“ اورنگ زیب نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

سطوت کرسی پر بیٹھی میز پر سجے ایک ڈیسک ٹاپ کپیوٹر مانیٹر کی اسکرین دیکھتے گزارتی۔

”مجھ میں نہیں آتا یہ منحوس کدھر سے تمہارے ہاتھ لگ گیا۔“ قمر آرا کا بس سطوت پر نہ چلتا تو وہ اس مانیٹر کو کونے لگتیں۔ ”جانتی ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پیسے پکڑاتی رہی اور تم ان پیسوں سے اپنے لیے یہ منحوس مشغلے خرید کر لاتی رہیں۔ خوب تم نے پیسے برباد کیے اور مجھے کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔“

وہ چار پائی پر بیٹھے بیٹھے آگے کھسک کر اس بے جان اسکرین کو دیکھنے کی کوشش کرتی جس پر جی سطوت کی نظریں اوپر اوپر ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ سطوت انہیں کبھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کپیوٹر اور کتابیں اس استری کی طرح اسے اپنی دلیز پر بڑی ملی تھیں جس نے ایک رات انہیں سردی سے بچایا تھا۔

”مے میں تو کبھی ہوں پر ہٹا کر مچانا تو تم نے ہے نہیں، یہ جو کتابوں کا ڈھیر مستوں میں بند کر کے الماری پر رکھ چھوڑا ہے، جا اسے ہی رومی میں بیچ آ جا کر۔ کچھ تو پیسے مل جائیں گے۔“ اس کی بے حسی قمر آرا کو مصلحت آمیز لہجہ اپنانے پر مجبور کر دیتی۔

”یہ کتابیں؟“ سطوت کی نظر مانیٹر سے ہٹ کر الماری پر جی کتابوں پر جا گھری۔ ”ان کے اندر تو میری سانس بند ہے۔ ان کے ساتھ میری زندگی کے چند خوش گوار دن خواب کی طرح چڑے ہیں۔ ان کے صفحوں پر تو زندگی بستی ہے اور حیات ہے۔ میں اپنے سانس اپنے خواب اور فحاشی کی جاتی زندگی کیسے دہی میں بھیج سکتی ہوں ای!“ وہ ذریعہ کرتی۔

”کچھ اور بیچنے کو بچا ہے اس گھر میں تو کہیں میں ابھی جا کر بیچ آتی ہوں۔“ وہ نظر اٹھا کر قمر آرا کی طرف دیکھتی۔

”محمدی بتا رہی تھی، نیچے داوی میں ننھے بچوں کا نیا اسکول کھلا ہے اسکول والے کم بڑھی لڑکیوں کو بھی ٹیچر بھرتی کر رہے ہیں، جا۔ محمدی کے ساتھ جا کر ایک درخواست تو بھی دے آ۔“ قمر آرا کو نیا خیال سوجھا۔ ”میں میٹرک سیکنڈ ڈویژن۔“ وہ سوالیہ نظروں سے



میں جس کے سامنے پارک تیلیوں سے بنی نازک چھن تنی رہتی تھیں۔ اب وہ چھن اور پرانگی اور بندھی رہتی تھیں اور جی بنی اور بنی ٹوٹی ولسن برآمدے کے ستونوں اور لکڑی کی ہری رنگ کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھی۔ اسکول کے لیے جاتے آتے سطوت ایک بار سر اور نظر اٹھا کر اسے ضرور دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنے دھیان میں چلے لگتی۔ اس کے روزانہ کے اس معمول کے دوران کبھی کبھار اورنگ زیب بھی اسے نظر آجاتا، مگر اورنگ زیب کا بھائی کہاں تھا اسے کچھ بتانہ چل سکا تھا۔ لی ایس کی فورٹھ ایر کے اسٹوڈنٹس کالج سے مکمل رخصت ہو چکے تھے۔ اسکول میں اس کے ساتھ کی بیچر اسے بتاتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر مزید پڑھائی کے لیے بڑے شہروں کی طرف چلے گئے تھے ایک اور اس کے تینوں دوست بھی اسی سلسلے میں وہاں چلے گئے ہوں گے اس نے خود سے سوچ لیا تھا۔

ڈاک خانے والے راستے اور تاج چاچا کے اسٹور کی باتیں دن گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید خواب ہوتی چلی جا رہی تھیں، لیکن وہ اسکول کی پرنسپل بھی جو کبھی کبھار اسے اپنے آفس میں بلا کر اپنے کا اظہار ضرور کرتی تھی۔

”میں نے سنا تھا تم اسکول میں ایک عام درجے کی طالبہ تھیں۔“ وہ کہتیں۔ ”اور کالج کی تعلیم بھی تم مکمل نہ کیا تھیں، لیکن تمہاری جنرل نائج میٹھس کی کھلکھولت اور انگریزی کی شدہ بدھ کالی اچھی ہے۔ ان سب کے ہوتے ہوئے تم عام درجے کی طالبہ کیسے رہ سکتیں۔“

”جب کیکولیشن کی سمجھ آنے لگی، ڈکشنری رٹ لینے کا سبق پڑھنے کو ملا اور سامنے والے پتھر پر بیٹھے فحش نے جنرل نائج کے خزانے میرے کانوں میں ڈالنے شروع کئے، وہ نصف رات سے ذرا پہلے کا وقت۔“ وہ پرنسپل کے سوال کے جواب میں سر جھکائے خاموشی کی زبان میں جواب دیتی۔ ”اس کے بعد بارہ بجے کا گھنٹہ بجنے میں ذرا سا وقت ہی باقی رہتا تھا۔ ابھی تو

”کبھی اپنی کم عمری، مصحوبیت اور بھولے پن میں اگر وہ قمر آرا کی جیسے داریاتوں میں اتنی کیا ہوگا تو پھر میرے ایک دفعہ سمجھانے پر دیکھا نہیں تھا کیا کم صم ہو گیا۔ شرمندگی اس کی نظروں سے بھٹکتی تھی۔ تمہیں تو بے کاری سننے اور آگے سنانے کی عادت ہی ہو چکی ہے۔“ صالحہ کا دل ایک سے جدائی پر پو بھل تھا، قمر آرا والے قصے پر دل کا لالہ ابھی تک نہیں گیا تھا۔ اس پر اورنگ زیب کی باتیں۔

”آپ نے بڑا عقل کا کام کیا ما! ما!“ ہاں کو یوں غصے میں آئے دیکھ کر اورنگ زیب نے بات بدلی۔

”جو ٹائٹ ایک کو یہاں سے نکالنے کی۔“

”کیا عقل کا کام کیا۔“ صالحہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بولیں۔ ”میری تو عقل مت سب ماری مٹی اس اندوئی کو سن کر یوں اخرا تفری میں اسے یہاں سے نکالنے کی پڑائی مجھے کہ اس کے رزلٹ تک کا انتظار نہ کرنے دیا۔ یہاں سے دیکھ بھال کر جاتا تو اچھی سے اچھی یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا تھا۔ اسے رزلٹ دیکھا تھا اس کا۔“ انہوں نے اورنگ زیب کو جتایا۔

”پورے ڈوژن میں ٹاپ کیا اس نے اتنے نمبر کوئی دو جنم میں لے کر دکھائے جتنے اس نے لے لیے پھر بھی اپنی مرضی کی یونیورسٹی میں داخلہ نہ لے سکا۔ میرے فیصلوں پر سر جھکا دیا بس۔“

”اس کی ڈگری کے ساتھ جرمنی کی کسی بھی یونیورسٹی کا نام لگا ہوگا تو یہاں ہاتھ لیا جائے گا“ فکر کیوں کرتی ہیں آپ؟“ اورنگ زیب نے سر جھکا۔

”فکر میں تو جیسے میری جان کو چٹ کر رہ گئی ہیں۔“

”صالحہ زیر لب بولیں۔“ ”اب تم بس تیاری پکڑو، میں نے بھائی جان سے بات کر لی ہے۔ اگلے مہینے ہم کراچی جا رہے ہیں، میں اور تم۔ بارانی۔ گھر میں ہو آجائے گی تو میرے دل کو بھی رونق کا کچھ احساس ہونے لگے گا۔“ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔



اوپر والے گھر میں ولسن آگئی تھی۔ محرابی برآمدے

ہو۔“ صالحہ فون پر ایک سے مخاطب تھیں۔  
”اب میں نے کیا کیا ہے اما؟“ وہ دھیسے لہجے میں بولا تھا۔

”دونوں مجھ سے بات نہیں کرتے ہو، کبھی کوئی خط بھی نہیں بھیجتے۔“ وہ گلہ کر رہی تھیں۔  
”میں ای میل بھیجتا تو ہوں اما۔ اورنگ زیب بھائی آپ کو پڑھا دیتے ہیں۔“

”جائے دو ای میلز کو۔ جو بات طویل خطوط میں تھی، وہ ای میلز میں کہاں۔ نے لفظ وہ بھی رومن انگریزی میں۔ نہیں، میری تسلی نہیں ہوتی۔“ وہ سر ہلاتی تھیں۔

”چھوڑیں ہاتھ سے لکھے خطوط کو اما۔“ اس نے سر اسانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب کون لکھتا ہے خط اوروے بھی خط لکھوں تو آپ تک پہنچے کیسے پاکستان خان کے بعد بستی کے لیے آج تک کوئی ڈاک آیا مقرر نہیں کیا۔ ٹکڑے ڈاک نے۔“

”میں منگوا لوں گی یا پھر خود لے آیا کروں گی جا کر۔ تم لکھو تو سہی۔“ انہوں نے بے قراری کے عالم میں کہا تھا۔

”آپ جاسیں گی ڈاک خانہ والے راستے پر۔“ وہ ہلکا سے مسکرایا تھا۔ میری ہانپے اوھر جانے کا کبھی سوچے گا بھی مت۔ وہاں پر ایک ایسا ونڈر لینڈ آباد ہے جس میں داخل ہونے کے بعد انسان خود سے باہر نکل نہیں پاتا، ہاں نکال کر باہر ہی دیا جائے تو اور بات ہے۔“

”چاہ نہیں کیا کہہ رہے ہو تم۔“ صالحہ جھنجھلا کر بولی تھیں۔ ”میری بات غور سے سنو، یا تو مجھے ہر دو سرے دن فون کیا کرو یا پھر خط لکھا کرو تفصیل سے۔ اتنی دور بیٹھی ماں کی یاد نہیں آتی تمہیں کیا۔ میں کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔ کن مسائل کا سامنا کر رہی ہوں۔ کچھ جانتے بھی ہو تم؟“

”مب آپ اموشنل بلیک میلنگ کرنے لگی ہیں۔“ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ”کیا میں جانتا نہیں کہ آپ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی عادی ہیں، ایسی

کالنج کا کلاسوں میں سزاؤں سے بچ کر سر اٹھا کر بیٹھنے کا سلسلہ ہی شروع ہوا تھا کہ بارہ کا ٹھنڈا بیج گیا اور میرے رتھ بان دو پارہ سے مینڈک بن گئے، میرا رتھ ایک عام سے کدو میں تبدیل ہو گیا اور میرا سنہری کرکوں والا لباس چھتروں کی شکل اختیار کر گیا۔“  
اس کی نظروں کی اداسی پر نیل کو اپنے دل پر اثر کرتی محسوس ہوئی۔

”کیا بات ہے سلوٹ سجاد، تم اتنی خاموش طبع کیوں ہو؟“ وہ اپنا سوال بدل دیتیں۔

”میں نے اپنی ای سے کہا بھی تھا ڈاک خانے کا راستہ طویل اور دشوار ہے، مجھے اوھر جانے سے ڈر لگتا تھا، وہ نہیں مانیں اور انہوں نے مجھے اس راستے پر بھیج دیا۔ دیکھ لیں میڈم! مجھے اس راستے پر جانے کی سزا ملی ہے۔ مجھے وقت کے بھینریے نے اپنے لیے بے باخونوں اور خوفناک واقعات میں دلوچ لیا ہے۔“ وہ نیل کو اپنے خاموش طبع ہونے کی وجہ بتانا چاہتی تھی مگر بتا نہیں پاتی تھی۔

”مینی ویز سلوٹ سجاد!“ بر نیل اس کی مسلسل خاموشی پر کمر اسانس لیتے ہوئے کہیں۔

”Keep working hard“ (محنت جاری رکھو) میں تمہارے کام سے خوش اور مطمئن ہوں حالانکہ تمہیں فہمکنگ کے لیے ہار کرنا ایک بہت بڑا رسک تھا۔“ وہ اسے جتنا نہ بھولتیں۔

”تمہاری کلاس کا ششماہی رزلٹ اچھا آیا تو میں تمہارے لیے اضافی پوائنٹس کی بھرپور سفارش کروں گی۔“

اور یہ بھی تو ڈاک خانے والے راستے پر بیٹھ کر بڑھنے والے اسبق کا کمال ہی تھا کہ سال میں دو پارہ اس کی تنخواہ میں اضافہ اس کی کارکردگی کی وجہ سے ہوا تھا۔ سلوٹ اس خواب سے نکلنے کی کتنی ہی کوشش کرتی، کیسے نکل سکتی تھی۔

\*\*\*

”تم جانتے ہو، تم میرے ساتھ اچھا نہیں کرتے



پار کے سوا اس کی کسی بات سے اختلاف تو کیا جواب دینے سے بھی گریز کرتیں۔  
 ”کہاں ہے وہ مختلف سرگرمیوں سے بھرپور زندگی؟“ انہوں نے کئی بار مریم کو اور نگ زیب سے بھی ایچھے ستا۔ ”جس کا حال تم اور ایک مجھے فون پر سنایا کرتے تھے۔“

جواب میں اور نگ زیب آئیں بائیں شائیں کرنے لگتا، اس پر پیوی کے حسن، فہانت، تعلیم اور رہن سہن کا رعب پڑ چکا تھا اور اب شاید اس نے دنیا کو رضوان کے بجائے پیوی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”ایک ہو شیار نکلا۔“ وہ اور نگ زیب کو اکساتے ہوئے کہتی۔ ”جانتا تھا نا کالج کے بعد یہاں کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اسی باپ، دلاوا کے نانے سے چلتی آرہی کہنی میں ریسرچ آفیسر لگ جاتا۔ جب ہی کنویں کا مینڈک بننے کے بجائے کبی اڑان بھر کر نکل گیا، اس مذہب اور ترقی یافتہ ملک کا باسی بننے اور تمہ۔“ وہ اور نگ زیب کی طرف دیکھتی۔

”تم کیوں نہیں سوچتے یہاں سے نکلنے کا۔ لوگ آگے کی طرف جاتے ہیں، تم — اتنا پیچھے رہ کر کلروں جیسی زندگی گزار دیتا چاہتے ہو۔“

صالہ سب سنتیں اور خواہش کرتیں کہ ان کے کلن بند ہو جائیں۔ یہ ہی وہ مسائل تھے جن کا تذکرہ انہوں نے ایک سے کیا تھا۔ جسے اس نے پاؤں میں اڑا دیا تھا۔ ان کا وہ دوستوں جیسا بیٹا داریہ میں جا کر یوں غیر بننا چاہا تھا جیسے یہاں کے معمولات اس کے لیے اجنبی ہوں۔ وہ سب کچھ سمجھ اور محسوس کر رہی تھیں، لیکن خاموش تھیں، جانتی تھیں کہ وقت نے حالات کی ڈور ان کے ہاتھ سے نکال کر دوسرے ہاتھوں میں تھادی تھی۔

پھر مریم کے دن رات مغز داری کا نتیجہ آہستہ آہستہ سامنے آنے لگا۔ اور نگ زیب پیوی کے ساتھ اس کی کسی سہیلی کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کراچی گیا اور سرس کے کہنے پر وہیں کسی ایسی کہنی میں

نہی تلی زندگی جس میں مسائل آپ کے قریب پھکنے سے بھی ڈرتے ہیں۔“  
 یہ کہتے ہوئے اس کے لمبے میں ہلکا سا طنز ابھرا تھا۔

\*\*\*

ایک صالحہ کے مزاج کو ٹھیک ہی جانتا تھا، لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ حالات بدل جاتے ہیں۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ مزاج بھی ڈھل جاتے ہیں اور صالحہ اسی عمل سے گزر رہی تھیں۔

گھر میں ہو اور وہ بھی ہو کی شکل میں اپنی بھتیجی اپنی دوسرا ہٹ کے خیال سے لاپٹی تھیں۔ جس نے کچھ عرصہ تو نئی شادی کے چاؤ چوٹیلوں میں گزار دیا اور پھر ان کے گھر کے گھر بندھے اصولوں اور معمول میں دخل انداز ہوئی۔ وہ ان کے سکے بھائی کی بیٹی تھی، لیکن میڈانوں کی کلین، ان برف پوش پہاڑوں میں گھری اس بستی کی مخصوص چال سے چلتی زندگی اسے موافق آرہی تھی تاہی پسند۔

”کیا لگتا ہے آپ لوگ ابھی بھی انیس سو ساٹھ“ ستر کی دہائی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس علاقے میں موبائل کے سکتلز کا حال کراچی کی گزراہوں جیسا ہے جو آئے روز شہر بند کر دیتی ہے۔“ اس کے چہرے پر تمسخر ابھرتا اور سٹلا مشلی وی کا تو تصور ہی نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی پیدائش سے لے کر اب تک بیٹی وی کے پروگرام نہیں دیکھے، آپ لوگ کیسے اتنے ففق و شوق سے دیکھ لیتے ہیں اس حکومتی تسلط میں جکڑے چینل کو۔“ اس کے لمبے میں بے زاری اپنے عروج پر محسوس ہوئی۔

”آپ نے لگتا ہے عمر بھر گھلوں میں سبزیاں اگا، نکا اور کھلا پھوڑیں، دن رات سبزی کھا کھا کر اور نگ زیب کا ذہن بھی آلو جیسا مونا ہو چکا ہے۔ مخصوص پاؤں کے علاوہ کچھ اور سوچنا ہی نہیں۔“

صالہ، ہو کے بھاشن سنتیں، ان کی طبیعت پر بوجھ پڑتا، مگر تھیں سمجھ دار، اسی لیے پہلے پہل کی چند ایک



کر دی۔ ”ان کے لمبے میں نفرت تھی۔ حقارت تھی یا کراہیت۔ اور نگ زیب فیصلہ نہ کیا تھا۔  
”تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کو اس مشترکہ جائیداد کی چوکیداری کا شوق چرا رہا ہے نا تو مجھے اپنا شوق پورا“ جب دل بھر جائے تو ہوتا دیکھیے گا۔ ہم اگر آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“

اور نگ زیب کے بجائے اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر جواب دیا تھا اور نگ زیب کو بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ اندر کمرے میں لے گئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہ میرے ساتھ؟“ انہوں نے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے حال پر غور کرنے کی کوشش کی۔ ”میں سینا نسل ہو رہی ہوں، ہندی اور غر داغ یا پھر میرا دل اب اس بہتی سے دور نہیں اور گلنے والا نہیں۔“ لاشعور میں جیسے اسی خوف کے تحت انکار کر رہی ہوں یا وجہ کچھ اور ہے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی انہیں اصل وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔



قمر آرا، دن بہ دن پہلے سے زیادہ بیمار، کمزور اور چڑچڑی ہوئی، طبی جاری تھیں۔ ان کے جسم کا ہر عضو بے کار اور کمزور ہو رہا تھا سوائے زبان کے۔ زبان جو طاقت ور تھی اور ہمہ وقت انکارے چبائے رکھتی تھی۔

سطوت، قمر آرا، گھر اور نوکری کی ذمہ داریاں نبھاتے لیکن ہو جاتی، لیکن قمر آرا کی زبان تھی جو شعلے اٹھاتے نہ ٹھکتی تھی۔ وہ سطوت کو طعنے، کوٹنے اور گالیاں دیتیں اور اس تقدیر سے گلے کرنے میں وقت گزارتیں جس نے انہیں عمر بھر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے نہیں دی تھی۔

”اللہ کا خوف کرو قمر آرا، یہ اس بچی بے چاری پر سارا غصہ نکال دو، ہو جو خود میثم ہے اور بے آسرا اور جسے تمہارے مزاج نے عمر بھر اپنی مرضی سے سانس تک نہیں لینے دیا۔ کیسی ماں ہو تم جو اسے کوٹنے اور

انٹرویو دے آیا، جس کا کام لی پلانٹیشن کمپنی کے فیلڈ سروے ڈیپارٹمنٹ سے ملتا جلتا تھا۔ انٹرویو کامیاب رہا اور اورنگ زیب کا اتنے سال کام کا تجربہ بھی۔ میدانوں کی باسی ہونے میدان مار لیا تھا۔ اورنگ زیب کا دل پھاٹوں میں گھری اس بہتی سے اٹھ گیا تھا۔

”تمہیں جانا ہے، تم جاؤ، میں ادھر ہی رہنے پر مجبور ہوں۔“ اورنگ زیب چاہتا تھا، وہ بھی اس کے ساتھ کراچی چلیں۔

”کیا کریں گی یہاں اکیلی رہ کر آپ؟ اور پھر مجبوری کیا ہے آپ کی؟“ اورنگ زیب کو ان کے جواب نے باپس کیا تھا۔

”یہ گھر یہ گھر میری مجبوری ہے۔“  
”کیوں مجبوری ہے یہ گھر؟ پچھیں اسے اور چلیں میرے ساتھ۔“

”کیسے بیچ ڈالوں؟ یہ مشترکہ جائیداد ہے، اکیلا اوپر کا اور شن کون خریدے گا۔“ انہیں اورنگ زیب کی عقل پر غصہ آیا، لیکن وہ اسے پیٹتے ہوئے پر سکون لمبے میں بولیں۔

”مشترکہ ہے تو کیا ہوا، آپ بات نکال دیں کہ بیچ رہی ہیں۔ نیچے والے چاہیں تو خود خرید لیں گے یا پھر نکلنا پڑے گا انہیں۔“

”وہ خرید سکتی ہے کیا؟“ صالحہ نے سوال کیا۔  
”کیوں نہیں خرید سکتیں، اوہرا دھر کے عاشقوں سے کم مال تو نہیں بنو رکھا انہوں نے ہمارے ایک تنک کی جب خالی کر ڈالی، وہ تو اس جیسے کئی مکان خرید سکتی ہوں گی۔ آپ ایسا کریں جائیں، ان سے خود بات کریں۔“ اورنگ زیب کی اس بات نے انہیں بری طرح بھڑکادیا تھا۔

”میں اور اس سے جا کر بات کر دیں۔ داغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“ وہ غصے سے لرزتے ہوئے بولیں۔  
”اتنے برس گزر گئے ہیں نے اس پر نگاہ تک نہیں ڈالی کہ کہیں میری نظر بلیڈ نہ ہو جائے، تم مجھے کہہ رہے ہو کہ جاؤں اور اس کے گھر میں بیٹھ کر اس سے بات

بددعا نہیں دیتے نہیں تھکتیں، کیا تمہارا دل اس کے آنے والے وقت سے خوف نہیں کھاتا۔“  
محمدی خالہ کبھی ادھر کا چکر لگاتیں تو قمر آرا کو احساس دلانے کی کوشش کرتیں۔ لیکن قمر آرا کو اپنی ذات کے علاوہ جیسے ہر چیز سے بیڑ تھا اور اس بیڑ کا سارا طیش سطوت پر نکلا۔

\*\*\*

”آپ کو مانا کو وہاں اکیلے نہیں چھوڑ آنا چاہیے تھا۔ تمہاری اس عمر میں ان کے لیے بہت بری ثابت ہو سکتی ہے۔“ لپ ٹاپ کی اسکرین پر ایک اور رنگ زیب کے سامنے بیٹھا تھا۔ منڈب جدید اور بڑے شہر میں آکر اورنگ زیب کا رابطہ دنیا کے ہر کونے سے بڑ چکا تھا۔ اس وقت ایک اسکائپ کال پر اس سے بات کر رہا تھا۔

”تم جانتے ہو وہ خدی ہیں اور من مانی کرنے کی عادی ہو چکی۔“ اورنگ زیب لاپرواہی سے بولا۔ ”میں صرف اس مشترکہ جائیداد کے تم نے وہاں روک رکھا ہے ورنہ آئی جاتیں میرے ساتھ۔“

”ان کا پورا نکتہ درست ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کے لیے کیا بہتر ہے۔ آپ کو وہاں سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ نے انہیں تنہا چھوڑ دیا۔“ اورنگ زیب نے دیکھا اس کا لالہ بلی زندگی سے بھرپور موج مستی کا دلدادہ شوخ و شنگ بھائی ایک سنجیدہ اور وجہیہ مزاج کے موٹوں ڈھل چکا تھا۔

”تم ایسا کرو تم واپس آ جاؤ، ڈگری تمہاری مکمل ہو چکی، اب تو واپس چلے آنے میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ آؤ اور آکر پھوپھو کے ساتھ رہو۔“ اورنگ زیب کے بجائے مریم نے جواب دیا تھا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اورنگ زیب احساس شرمندگی پر امکان کے چھینٹے پڑے۔ ”ویسے بھی میں نے سنا ہے کہ۔“

”پلیز اورنگ زیب بھائی بس کریں۔“ ایک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکے ہوئے کہا۔ ”اب تو

سننا چھوڑ دیں۔“ اورنگ زیب حینب گیا۔  
”رہی بات میرے واپس آنے کی۔“ پھر وہ مریم سے مخاطب ہوا ”تو میں تو وہاں سے نکالا گیا۔ ہوں واپس کیسے آسکتا ہوں۔“ اس نے کہا تھا اور کچھ لمبے بعد سائن آؤٹ کر گیا تھا۔

”سب کے پاس اپنے اپنے بھانے ہیں۔“ اس کے سائن آؤٹ کر جانے کے بعد مریم نے اورنگ زیب کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ ”دیکھ لو اب کتنے سکون سے اس نے بھانا کر دیا کہ اس کو تو وہاں سے نکالا گیا تھا۔ صاف تم پر اور پھوپھو پر طنز کر رہا تھا۔“

”بات یہ نہیں ہے کہ وہ پھوپھو کے رویے پر ناراض ہے اصل بات یہ ہے کہ اس کی قمر آرا بوزھی اور بیمار ہو چکی ہے۔“ مریم کے لہجے میں مسخر تھا۔

”شٹ اپ مریم! شٹ اپ!“ اورنگ زیب نے خود کو کہتے سنا تھا۔

\*\*\*

مرا کے وہ مختصر دن تو ادھر ادھر کے کاموں میں گزر جاتے تھے، لیکن وہ راتیں تھیں جو طویل تھیں اور تمہائی کے احساس سے بھرپور۔ وہ ساری ساری رات کروٹیں بدلتی رہتیں، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور بھاگتی پھرتی۔ ان کا جسم لینے لینے دیکھنے لگتا اور پھر کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور کبھی کمرلوں میں ٹپکنے لگتیں۔ مسلسل تمہائی ان پر یاسیت اور قنوطیت کی کیفیت طاری کر رہی تھی۔

وہ بھی ایسی ہی ایک بے خواب رات تھی جب وہ بے خوابی کا شکار ہو کر مختصر سے برآمدے میں کھلنے لگی تھیں۔ گزری سے بنی محرابوں پر چھین تنی تھیں، پھر بھی برف پوش پہاڑوں سے آلی بچہ ہوا تیر کی طرح جسم میں سمی جاتی تھی۔ گرم اپنی شمال میں لپٹی وہ یوں ہی ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھیں، جب انہیں محسوس ہوا کہ قریب ہی کہیں کسی ذی روح کی دھوکنی کی طرح سانس چلنے کی آواز خاموشی کی چادر کو پھاڑنے



گئی تھی۔ انہوں نے چوکنا۔۔۔ ہوتے ہوئے  
 دائیں بائیں اوپر نیچے دیکھ کر وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر  
 اس سانس کی آواز تھی کہ بلند ہی ہوئی چلی جا رہی  
 تھی۔ جیسے کوئی مشقت بھرا کام کیا جا رہا ہو۔

صالحہ گھبرا کر برآمدے میں رکھی آرام کرسی پر بیٹھ  
 گئیں۔ لمحہ بہ لمحہ سانس کا وہ زبردست دم رات کے سناٹے  
 میں پہلے سے زیادہ بلند آواز پیدا کر رہا تھا۔ پھر اس میں  
 ایک ایسی اذیت کی آواز شامل ہو گئی جیسے کسی جانور کا گلا  
 کاٹا جا رہا ہو، جیسے کوئی نزع کے عالم میں سختی سے آسانی  
 چاہ رہا ہو۔ صالحہ کی آنکھیں وحشت اور خوف کے  
 مارے جیسے اٹل کر رہ گئیں۔ وہ جوتی کی طرح  
 چلتے سانس میں آہیں، سسکیاں فریاد اور فٹیس شامل  
 ہونے لگیں۔ یقیناً وہ کوئی خراب دیکھ رہی تھیں یا پھر  
 اس تنہا بے آباد گھر میں کوئی غیر مخلوق کن بسیرا کر رہی  
 تھی۔

اس شدت کی سروری میں بھی وہ سر تپا سینے میں  
 بیٹھ گئی تھیں۔ دعائیں، آیتیں، سورتیں، آہستہ  
 کہہ بھی یاد آ رہا تھا وہ درد کیے چلی جا رہی تھیں۔ حلق  
 میں اگلے کسی سانس کے اندر چرھاؤ کی سی وہ آواز  
 رات گزرنے کے ساتھ ساتھ پہلے سے ہلکی اور ہلکی  
 ہوتی چلی گئی۔

بہت سی کی مسجد سے مولوی نیاز محمد نے فجر کی اذان کا  
 آغاز کیا۔ صالحہ کا بچہ بدن پر قابو پانے کی ناکام کوشش  
 کرتی اٹھ کر غسل خانے کی طرف چل دیں۔ کمپنی کا  
 ملازم بچہ ابراہیم گزشتہ رات پانی کے گرم حمام میں  
 لکڑیاں سلگا کر گیا تھا۔ غسل خانے کی ٹوٹی میں سے  
 مگر مپائی نکل رہا تھا۔ انہوں نے دل پر قابو پاتے ہوئے  
 وضو کیا اور توہلے سے ہاتھ منہ خشک کر کے نماز کی چوکی  
 پر جا کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ پورے دھیان سے رکوع و  
 سجود میں مشغول رہتا چاہتی تھیں، تاکہ دھیان پھر اس  
 روکنے کھڑے کر دینے والی آواز پر نہ جانے پائے۔  
 کمرے کے اندر وہ اس آواز کی رسائی سے محفوظ  
 تھیں۔ سلام پھیر کر انہوں نے آتش دان میں موجود  
 لکڑیوں کو آگ دکھائی اور وہاں جابجا نماز پر آکر بیٹھ

گئیں۔ اب وہ تسبیح کرنے میں مگن تھیں۔ ان کا  
 دھیان ہر طرح کی آواز سے ہٹ چکا تھا۔ صبح کے  
 ساڑھے سات اور پونے آٹھ بجے کے درمیان انہوں  
 نے اٹھ کر جابجا نماز کی اور چائے بنانے کی غرض سے  
 کچن کی طرف آگئیں۔ دلدی میں ابھی تک کھور  
 اندھیرا اور سناٹا پھیلا تھا۔ مہانوں پر بکھرے مکانوں  
 میں کہیں کہیں جلتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔  
 ”پی! اس تاریکی اور سناٹے میں کہیں ایک دل  
 چرتی آواز ابھری اور صالحہ کے ہاتھ سے سانس پین کا  
 گرم ڈھکن چھوٹ کر نیچے گر گیا۔



”صمت رو میری بچی۔ شکر کر“ اللہ نے اس کی  
 مشکل آسان کر دی۔ ”محمدی خالہ سطوت کو اپنے  
 ساتھ لگائے نسل دے رہی تھیں۔ ”دیکھ رہی تھی نا،  
 کیسے وہ دن سے حلق میں اگلی تھی اس کی جان، کیسے  
 تڑپتی تھی، کیسے سر پھٹتی تھی اوھر سے اوھر۔ شکر کر،  
 معافی ہوئی اس کی اور آسانی مل گئی۔ ”وہ سطوت کو نسل  
 دینے کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کو بھی ہاتھ لگا رہی  
 تھیں۔

”آہنی سختی، آہنی اذیت۔“ کہیں وہ محمدی خالہ! اگلے  
 جہان میں امی کی اب تو بخشش ہو جائے گی نا! اس کی  
 ماں اسے اتنی پیاری تھی۔ اس وقت اس کو صرف اس  
 کی بخشش کی فکر تھی۔  
 ”جان جس کی امانت تھی، اس کو لوٹ گئی۔“ محمدی  
 خالہ نے اس کے بل سسلائے ہوئے کہا۔ اب وہ  
 جانے اور اس کا مالک جانے۔ تم بس جتنی دعا کر سکتی ہو  
 کرو اور قرآن پاک پڑھ کر اس کی روح کو بخش دو۔ اللہ  
 اس کے لیے آسائیاں فرمائے گا۔“

اس کی ماں نے ساری عمر اس کو ذہنی اور جسمانی  
 اذیت دینے میں گزار دی تھی۔ اپنی عمرو میں بے بسی  
 اور خواہشات کی ناکامی کا غصہ وہ اس پر نکال دیتی  
 تھیں۔ ان ہاتھوں کی مار سستی اور اس زبان سے گالیاں  
 سستی، وہ اس عمر کو آچکی تھی۔ اس کا کوئی بھی عمل



کوئی بھی کوشش اس کی ماں کے منہ سے اس کے لیے  
کلہ خیر یا دعا نہ نکال سکی تھی۔ پھر بھی وہ اس معذور  
کنزور وجود کی جو ہمہ وقت چارپائی پر دھرا رہتا تھا، اتنی  
عنادی ہو چکی تھی کہ اس سے جدائی نے اسے ڈھا دیا  
تھا۔

”اللہ اپنے بندوں کے لیے آستیاں کرتا ہے  
سطوت!“ اسکول کی ریسل نے اس سے قمر آرا کی  
تعمیت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم نے بہت سختیاں  
سہیں، شکر کرو سر پر اپنی چھت موجود ہے اور تم اپنی  
محنت کی کمائی کھاتی ہو۔ اللہ آگے بھی تمہارے لیے  
آستیاں ہی کرے گا۔“

”کیسی آسانی اور کہاں کا سکون!“ چند ہی دن بعد  
دوبارہ اسکول میں ڈیوٹی پر لوٹتے ہوئے اس نے سوچا  
تھا۔ ”جب آپ کا اپنا کوئی سر رہے نہ ارد گرد کہیں  
موجود ہو تو پھر زندگی کیسی۔“ اسکول صوبا کی چھٹیوں کے  
بعد اسی روز نکلا تھا۔ مجھے سنے بچوں کی محصور باتوں  
نے اسے وقتی طور پر ہلادیا۔ لیکن واپسی پر وہی تنہائی  
اور سناتا صبح کا صاف کیا گھر چوں کا توں صاف ستھرا  
سمٹا کچھ کر اس کا دل اڑنے لگا۔ نہ گالیاں رہی تھیں  
نہ بددعا جس نہ طعنے نہ ہی کو سنے وہ بالی کا وقت بستر  
اوندھی لٹی آنسو ہالے میں گزار دیتی۔

\*\*\*

”یہ ہی دن تھے نا“ اسی طرح کے دن۔“ وہ ڈاک  
خانے والے راستے پر بڑے پتھر پر بیٹھی سوچ رہی  
تھی۔ ”جب زندگی کے سبق پڑھنے پڑھانے کا آغاز ہوا  
تھا۔“ اس نے سامنے پھاٹوں کی ڈھلوانوں پر راستوں  
اور جھاڑیوں میں جا بجا آگے ڈیزیز کے زرد مرکز والے  
سفید ہتکھڑیوں سے سجے پھولوں کو دیکھتے ہوئے سوچا  
اور ایک لمبا سانس لیتے ہوئے ان کی خوشبو کو اپنے اندر  
اتار۔

”اسے ہی دن تھے جب خواب سفر کا آغاز ہوا تھا۔ ایک  
ایسا سفر جو کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ جس کی کوئی منزل  
ہوتی ہے نہ ہی جائزہ منزل ایک ایسا سفر جس میں ہر لمبی  
نظر کا دھوکا ثابت ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہولے  
بن کر غائب ہو جاتے ہیں۔“ نظر سے القیاس کا سفر  
جس میں مرکز دیکھو تو نگاہ بگاڑ مسرت سر خوشی اسی خود  
فریبی کی دنیا میں ستاروں کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے  
اور پھر تاریکی، ناامیدی اور مایوسی کی پگڑیاں شروع  
ہو جاتی ہیں۔ تاریکی، مایوسی اور ناامیدی جو میرے  
جیسی لڑکی کا مقدر ہیں۔ اس نے پھر سے آگے بل  
کھائی سڑک کو دیکھا۔ اسی راستے پر جینز کی جیبوں میں  
باتھ ڈال کر چلے، ہنستے مسکراتے، اس نے سطوت کو  
نکتی باتیں بتائی تھیں۔ اسے دنیا سے متعارف کروایا  
تھا۔ اسے سر اٹھا کر جینا سکھایا تھا۔ اس کی نظریں  
گزرے منظروں میں کھو گئیں۔ ہوا میں کھوئی  
آوازوں میں اس کی سماعتیں گم ہو گئیں۔  
”میں بہت تالاف ہوں، میرا دل بہت بڑا ہے۔“  
اس نے کئی بار ایمان داری سے اعتراف کیا تھا۔

”سنہ ہے چچی قمر آرا گزر گئیں۔“  
اورنگ زیب نے فون کلپ پر صالچہ سے پوچھا تھا۔  
اورنگ زیب کے سوال نے انہیں وہ بھیا تک رات یاد  
کرادی تھی۔ جب عین ان کے گھر کے نیچے ایک صبح  
نفس غصہ سے پرواز کر جانے کے لیے بے قرار تھی  
اور نفس سے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے  
جھر جھری لیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔  
”بس اب تو بڑا کاٹنا نکل گیا۔“ اورنگ زیب کہہ رہا  
تھا۔ ”آپ کو چچی قمر آرا ہی سے مسئلہ تھا نا، اب آپ  
ان کی بیٹی سے بات کیجیے یقیناً“ تر کے میں بہت کچھ  
چھوڑ گئی ہوں گی اس کے لیے کہیے اس سے کہ یا تو

لینے پر اس نے کچھ شرابے اور چھکتے ہوئے کہا تھا۔  
”تمہارے اندر ایک نہیں، ایک ہزار ایک خوبیاں  
موجود ہیں، تم ایک سپہر (دریافت) تو کر کے دیکھو۔“  
جواب میں وہ اس کا میٹ پڑھتے ہوئے مسکرا کر بولا  
تھا۔

”تم میرا دل رکھنا چاہتے ہو نا؟“ اس نے سوال کیا  
تھا۔

”میں بھلا تمہارا دل کیوں رکھنا چاہوں گا۔“ وہ بے  
نیازی سے بولا تھا۔

”اس لیے کہ تم خود دل کے بہت اچھے ہو۔“  
سطوت نے برلا اعتراف کیا تھا۔ جواب میں وہ کچھ دیر  
اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

”تم نے کبھی دروازہ تو کھولا ہے۔“ اس نے  
پوچھا تھا۔

”ہاں!“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”یہ وہی ہے نا جس کی  
ایک نظم انگریزی لازمی کی کتاب میں شامل ہے۔ اللہ

جائے کیسی انگریزی لکھتا تھا۔ دروازہ کھولے پڑ جائے  
”رے پاگل! بہت بڑا شاعر ہے دروازہ تو کھولا۔ تم

اس کی انسلٹ کر رہی ہو۔“ وہ ہنسا۔  
”ہوگا“ مجھے کیا۔“ وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔ ”مجھے تو

بس اس کی نظم کی سری نہ کلکنی پڑ جائے امتحان  
میں۔“

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا تھا۔ ”پتا ہے،  
تمہیں دیکھ کر مجھے دروازہ تو کھولنے کی نظم یاد آجاتی ہے۔“

”ہاں!“ وہ حیرت سے بولی تھی۔ وہ کھل گیا  
ہے اس میں۔ ”اور اس نے اسے نظم سنانا شروع  
کر دی تھی۔“

The fall of water that doth make  
A murmur near the silent lake  
This little baya quite road  
That holds in shelter thy abode  
In truth together do ye seem  
Like something fashioned in a dream

”جو کوئی بھی تمہیں ایسا کہتا ہے، یہ اس کی معمول  
ہے۔“ نیلی جینز پر مہموں سو پٹر اور سیاہ جیکٹ پہنے وہ  
لڑکا اسے بتاتا تھا۔

”دنیا میں ہر انسان کو اللہ نے ذہن عطا کیا ہے۔  
ذہن کی استطاعت میں فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن

استطاعت کا پتا بھی تو تب چلے نا جب اسے استعمال کیا  
جائے۔ تم ایک فضول سی بات پر یقین کرنے سے پہلے

ذہن کو استعمال تو کر کے دیکھو۔“  
”کوئی فائدہ نہیں، میں نے بہت کوشش کر کے دیکھ

لی۔“ وہ مایوسی سے سر ہلائی میڈم صدیقہ کہتی ہیں کہ  
انہیں میرا آئی کیو لیول بھی صفر پر کھڑا محسوس ہوتا

ہے۔“  
”غلط کہتی ہیں وہ۔“ وہ بلند آواز میں کہتا۔ ”وہ کلچر

کی سب سے کام چور استاد ہیں۔ اسٹوڈنٹ پر محنت  
کرنے سے گھبرا جاتی ہیں۔ تمہارا آئی کیو لیول اچھا خاصا

ہائی ہے۔ ہاں تمہارا ذہن ضرور کمزور ہے۔“  
”نہیں جی، ایسا کوئی بھی نہیں کہتا۔ کوئی نہیں

مانتا کہ سر ہلائی۔“  
”کھیل نہیں کوئی کہتا اور مانتا۔“ وہ شہید ہو جاتا۔

”دھرو دیکھو میری طرف،“ میں پورے ہوش و حواس  
کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم بہت ٹیلنٹڈ لڑکی ہو، تمہارا

دلچ بھی تیز ہے اور حافظہ بھی آنا کر دیکھ لو۔“  
اس نے آنا کر دیکھا بھی تھا۔ چند ہی دنوں میں اس

کو چھ برس پوری تفصیل اور درست کے ساتھ یاد  
ہونے لگی تھیں اور اس نے ان ہی میڈم صدیقہ کو

جہاں بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ اس کے پڑھنے کے  
لیے کورس کی کتابوں سے ہٹ کر اور کتابیں بھی لانے

لگا تھا۔ اسٹوری بکس، مطالعاتی کتابیں، چھوٹے  
چھوٹے انسائیکلو پیڈیا، پچھڑے مشینز اور انٹس، کیا تھا جو

سطوت کی سمجھ میں نہ آتا تھا، کیا تھا جو اسے یاد نہ رہ جاتا  
تھا۔ صرف سکھانے والے کا طریقہ ہی تو مختلف تھا۔ وہ

سب کچھ سیکھتی اور جانتی چلی جاتی۔  
”چلو اچھا ہوا“ میرے اندر بھی کوئی ایک خوبی پیدا

ہوئی۔ ”پہلی بار تحریری ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر



اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ قمر آرا کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہاں کیا کر رہی تھی۔ شاید ماں کی طرح سر راہ چلتے ہوؤں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے بیٹھی تھی۔

پھر انہوں نے اپنے ہی خیال پر لا حول پڑ گئی۔ وہ لڑکی بے ضرر تھی اور مرتجان مرچ انہوں نے بھی اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی اور تک نسیب اور رضوان سے بھی نہیں۔

”مگر وہ اس راستے پر یوں اکیلی کیوں بیٹھی تھی۔“ وہ کچھ دیر کھڑی سوچتی رہیں اور پھر چھڑی کے سمارے چلتی آگے نکل گئیں۔

ان کے پیچھے پھر ڈبزی کے پھول گود میں رکھے لڑکی بے خودی کے عالم میں ان نظموں کی لائیں دہرا رہی تھی جو اسے بار بار یاد کرائی گئی تھیں اور جو اس سے بار بار سنی تھیں۔



اگلی بار سالہ نے اسے اپنے گھر کے نیچے بچھواڑے کے صحن میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ غالباً ”نہالنے کے بعد ہلکی دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اس روز سالہ کو صبح سے ہی

## مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری خواتین ڈائجسٹ کے ناول گھر بیٹھے حاصل کریں

## 30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر ڈاک خرچ - 100/- روپے فی کتاب مٹی آرڈر کریں۔

منگوانے اور ذاتی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

(یہ جھرنے کی طرح بہتا پانی خاموش جمیل کے قریب کو جی ٹنگنا ہٹ چھوٹی سی خلیج اور پر سکون سڑک جہاں قاحم ہے تیری نہاد گاہ حقیقت میں دینی ہیں ایک دوجے کے لیے)

وہ ان منظموں میں کھوئی زیر لب وہ نظم دہرا رہی تھی۔ اس کے سر سے چادر کھسک گئی تھی اور بالوں کی لٹیں ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھیں۔

The lake the bay the water fall  
And thee the spirit of them all

(جمیل، خلیج، آبرار  
اور تم ان سب کی روح)

کون کتنا تھا اس کا دل غلکا اور حافظہ کمزور تھا۔ اس نے نظم کی لائیں دہراتے ہوئے سوچا۔ وہ جو اسے خوابوں کے جزیرے میں چھوڑ کر جا چکا تھا، اس نے اسے حافظہ تیز کرنے کی اتنی مشقیں کرائی تھیں کہ اب شاید ہی اسے کوئی چیز مان ہو، وہ بھی جس نے اسے زندگی سے متعارف کروایا تھا اور زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے اکیلی چھوڑ گیا تھا۔

بیروں میں جو گر زپتے ہاتھ میں چھڑی پکڑے بیوی چادر میں لپی سالہ ڈاک خانے سے ہو کر واپس آ رہی تھیں، جب راستے میں انہوں نے اس لڑکی کو پتھر پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کی گود میں ڈبزی کے پھول رکھے تھے اور وہ سامنے خلا میں دیکھتی زیر لب کچھ دہرا رہی تھیں۔

سالہ ایک لمبے عرصے کے بعد اتنی چڑھائی چڑھ کر ڈاک خانے گئی تھیں۔ انہیں ایک کے نام ایک خط پوسٹ کرنا تھا۔ جاتے ہوئے بھی وہ جگہ جگہ بیٹھ کر سانس لینے کے بعد دوبارہ چلنا شروع کرتی رہی تھیں اور اب واپسی پر بھی ان کا سانس پھول رہا تھا۔ کچھ دیر میں رک کر انہوں نے بے خودی کے عالم میں بیٹھی



نے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا۔  
 ”جھا!“ صالحہ نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔ ”تمہاری  
 اہل کو تو گوشت بہت مرغوب تھا۔ وہ بھی بڑے کا وہ  
 آلو میٹن ڈال کدو۔ کہاں نکالتی ہو گی؟“  
 ”بڑے کے گوشت پر ہی تو انہوں نے بینک بیلنس  
 زمین پیسہ سب لٹا دیا۔ جب ہاتھ بھار کر بیٹھ گئیں تو یہ  
 ہی کچھ کھائے کو ملتا تھا نا۔“

وہ لوہی سے مسکرائی تھی۔ جواب میں صالحہ نے  
 بھی اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ ثنائی اور ثنائی کی  
 وحشت ان دونوں کو جنسوں نے ایک ہی چھت کے  
 تلے اور نیچے رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو ڈھنگ  
 سے دیکھا تک نہ تھا۔ ایک دوسرے کے قریب لے  
 آئی تھی۔ دونوں کے درمیان بنا کچھ کہے سنے ایک  
 نامحسوس سا تعلق بڑھ چکا تھا اور یہ سب اتنی خاموشی  
 سے ہوا تھا کہ ”سنائے“ کہ آغاز کے ساتھ خبریں  
 سننے والوں کو بھی خبر تک نہ ہوئی تھی۔



”تم ایسا کرو اپنا ضروری سامان اٹھاؤ اور ادھر اوپر ہی  
 آجاؤ مستقل۔“ اس کے ساتھ میڑھیاں اترتے  
 ہوئے صالحہ نے سطوت سے کہا تھا۔ ”کیا رات کو اکیلے  
 سونے کے لیے نیچے چلی جاتی ہو، ادھر تم ڈرتی ہو، ادھر  
 میں ڈر کے مارے سو نہیں پاتی۔“ ان کے لہجے میں  
 دوستی اور تعلق بے تکلفی اور خلوص کی انوکھی آمیزش  
 صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”جھا!“ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا تھا۔  
 ”چلیں ٹھیک ہے۔“ گھگھکی لہجے وہ مان گئی تھی۔  
 ”چلو۔ ایسا کرتے ہیں، ابھی اٹھالائے ہیں تمہارا  
 سامان۔“ میڑھیاں اتر کر صالحہ نے اس گھر کے  
 دروازے کی قدم پر ہوا دیے تھے، جس میں عمر بھر داخل  
 نہ ہونے کی قسم کھائے بیٹھی تھیں۔

”آپ۔ آپ رہنے دیں، میں خود، میں خود  
 اٹھالائیں گی۔“ ان کے عقب سے سطوت کی ہچکچی ہٹ  
 بھری آواز سنائی دی تھی، لیکن وہ اس کی سننے بغیر داخل

سر کے درد نے گھیر رکھا تھا اور گھر کا خالی پن انہیں  
 ہولائے جا رہا تھا۔ اتوار کے دن کمپنی کا دفتر بند تھا اور  
 اس کے وہ درگزر جو دن میں ایک آدھ پارافروں کے  
 حکم پر ان کے گھر کا چکر لگا کر کسی ضرورت کے بارے  
 میں پوچھ لیتے تھے وہ بھی چھٹی منار ہے تھے۔

”وقت ہے کہ گزراے نہیں گزرتا اور وحشت  
 ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔“ نشست گلو کی کھڑکی  
 سے نیچے جھانکتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔ اسی دم  
 نیچے صحن میں بیٹھی لڑکی کی آسمان پر کچھ تلاش کرتی  
 نظرس آسمان سے واپس آتے ہوئے ان سے ٹکرائی  
 تھیں۔ صالحہ کی نظروں میں شاید اس کے لیے کوئی  
 پیغام چھپا تھا اور اس کی نظروں میں اس پیغام کا جواب  
 تھا۔



”منگو چیاں کھائیں ہی کبھی تم نے؟“ صالحہ نے  
 چولے پر رکھی ہانڈی میں سالابھونٹے ہوئے پوچھا  
 تھا۔

”منگو چیاں۔ وہ کیا؟“ چھوٹی سی ڈانٹنگ نیپیل پر  
 ٹرے رکھے چاول چننے میں مشغول لڑکی نے سر اٹھا کر  
 بچن کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔  
 ”تمہاری تو بھی پکائے اور کھانے کے معاملے میں  
 بھی ناچ بہت محدود ہے۔“ سالے میں مڑوا ل کر  
 بھوننے کے بعد اس میں پانی ڈال کر انہوں نے ہانڈی پر  
 ڈھکن لگایا اور ڈانٹنگ روم میں آ گئیں۔ ”کھلاتی کیا  
 رہیں تمہاری اہل تمہیں ساری عمر؟“

”وہ تھوڑی پکائی اور کھلاتی تھیں، یہ کام تو میں کرتی  
 تھی۔“ اس نے چاول کے دانے منہ میں ڈالتے ہوئے  
 جواب دیا تھا۔

”چھا!“ نیپیل کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے  
 انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔ ”اور کیا پکائی کھلاتی تھیں  
 تم بھلا؟“

”ایک روز آلو میں بیٹکن، اگلے روز بیٹکن میں آلو،  
 ایک روز ڈال میں کدو، اگلے روز کدو میں ڈال۔“ اس

دو دانے کی کندی کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

\*\*\*

نشت گاہ کی سیئر ٹیبل پر چائے کے کپ پڑے پڑے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور وہ دونوں آنے سانسے صوفوں پر بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھیں۔

”ایک کاڈیک ٹاپ سائفر اس کی کتابیں اس کے بچپن سے سنبھالے کھلونے سب کے سب اس کے گھر میں کسے چلے گئے۔“ صالحہ سوچ رہی تھیں۔ سلطوت کے گھر میں داخل ہوتے ہی جس چیز پر ان کی پہلی نظر پڑی تھی وہ ایک کے مائیکرو کی کھلی اسکرین تھی جس پر اس کی تصویر صاف نظر آرہی تھی۔

”کیا واقعی وہ یہ سب چیزیں قمر آرا کو دے گیا تھا۔“ ان کا دل شش و پنج میں گرفتار تھا۔ ”اس کا مطلب اور تک زیب کا خیال درست تھا۔“ وہ سوچ رہی تھیں۔

”یہ اس کا گھر ہے وہی گھر جس کی طرف سرائیگر دیکھنے کی جرات بھی بھی بھاری ہوتی تھی اور آج میں اس گھر میں بیٹھی ہوں۔ گھر وہاں نہیں ہے۔ کتے ہیں عملاً تعلیم حاصل کرنے سمندر پار چلا گیا۔ ارے جانا تھا ضرور چلا جاتا۔ میں نے کون سا روک لپٹا تھا مگر جاتے جاتے بتا کر جانا، ایک بار چند لمحوں کے لیے الوداعی ملاقات تو کر جاتا۔“ صالحہ کے عین سامنے صوفے پر بیٹھی سلطوت سوچ رہی تھی۔

”پتا نہیں بات شروع کیوں سے ہوئی تھی۔“ اپنے خیالوں میں گم صالحہ بیویاں تھیں۔

”بات۔“ اب کے سلطوت نے بے خیالی میں کہا تھا۔ ”بات تو صرف ایک استری سے شروع ہوئی تھی۔“

”استری۔“ صالحہ نے چونک کر دیکھا تھا اور ایک پار پھر دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائی تھیں۔

\*\*\*

لاہور آجائے اور یونیورسٹی میں ایم ایس کی میں داخلہ مل جانے کے بعد رائے کی زندگی اتنی مصروف ہو گئی تھی کہ اسے پمانوں میں کھری اس وادی میں گزارنے کی زندگی پر بعض اوقات بھی آنے لگتی۔

”کسے محدود اور مخصوص دن تھے وہ بھی پابری ترقی یافتہ زندگی سے دور تھی بندھی ہوئیں اور ہم اس میں بھی کتنے خوش رہا کرتے تھے۔“ اسے خود پر حیرت ہوئی۔

یونیورسٹی کے نئے دوستوں اور استادوں نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان سب کے سامنے جو این لائی اور دوسرے استادوں کا علم پانی بھرتا محسوس ہوتا تھا۔ لاہور آجائے کے بعد ظفر اور معاذ سے رابطہ رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی ادارے میں پڑھ رہے تھے۔ ایک کے بارے میں ان ہی سے پتا چلتا تھا۔

”اس بستی کی محدود زندگی ہی تو تھی جس میں میں ایک کو پہلا اور آخری شخص سمجھے بیٹھی تھی۔ وہاں ہوئی تو اب تک ایسا ہی سمجھ رہی ہوئی۔“ بھی کبھی اس کو خیال آتا۔

”ایک سے کتنا“ اب غصہ چھوڑ دے۔ کتنی معمولی سی بات تھی جس پر ناراض ہو کر اس نے گروپ سے علیحدگی اختیار کر لی اور ابھی تک مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں اسے۔“ اس نے ظفر اور معاذ کو ایک کے لیے بیٹام بھی دیا تھا، لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

”لگتا ہے وہ ابھی تک بستی کے ہیرو ور شپ دونوں میں زندگی گزار رہا ہے۔“ بھی ٹھیک ہے اس چھوٹی سی بستی کا ہیرو تو وہی تھا نا۔“ وہ سوچتے سوچتے مسکرا رہی۔ اسے ایک کی ناراضی اس کا بچپنا محسوس ہوتی تھی اور اسی وجہ سے اس کے دل میں آہستہ آہستہ ایک کے لیے جگہ کم ہوتی گئی تھی۔

لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ اسے گرمی کی چٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے پاس ملا بیٹھا جانا تھا۔ ایک نئے ملک کی سیر کے تصور نے رائے کو خوشی کے احساس میں جکڑ رکھا تھا اور وہ جانے کی تیاریوں میں



مصروف تھی۔  
”جائے سے پہلے اپنے کمرے کی صفائی اچھی طرح کر کے جاؤ“ جو فالتو چیزیں ہیں انہیں ایک جگہ اکٹھی کر جانا، میں پینک دول کی۔“ یہ اس کی ماما کی خاص ہدایت تھی۔

ان فالتو چیزوں میں جو وہ ایک جگہ اکٹھی کر رہی تھی وہ بیک بھی تھا جو ایک عرصے سے اس کی اپنی میں ہوں ہی مڑا تڑا رکھا تھا۔ کپڑے کے اس بیک پر کشمیری گڑھالی کی ہوتی تھی اور یہ بیک اس کے بابا بھتیجا گلی سے اس کے لیے خرید کر لائے تھے۔

”ہائے یہ بیک تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔“ اس نے بیک نکال کر دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”یہاں لاہور میں تو سب اسے دیکھ کر اچھل ہی پڑیں۔“ وہ بیک پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی سلو میں نکالنے لگی۔ ہاتھ کے دباؤ کے نیچے اسے محسوس ہوا کہ بیک کے اندر کچھ چیزیں رکھی ہیں۔ اس نے بیک کی زپ کھولی اور اس کی نظروں کے سامنے ایک پرانا منظر کھوم گیا۔ ایک کے گھر کی بیڑھیوں کی ہری رنگ سے لٹکاؤ شاپر جس میں کفنڈکی کتریں بھری تھیں۔

”اف!“ اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ”اس وقت سے اب تک میں رکھا ہے میں اسے بھینکنا بھول ہی گئی۔“ اس نے مڑا تڑا شاپر باہر نکالا اور اس میں موجود کترنوں کو مٹھی میں دیوچ کر دیکھنے لگی۔ ان کترنوں میں کچھ ایسا غیر معمولی تھا۔ جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ مختلف رنگوں کے کفنڈوں کی کتریں تھیں اور ہر کترن پر الفاظ درج تھے۔ رائے کو سب کام چھوڑ کر ان کترنوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد وہ ہر رنگ کی کترنوں کو آپس میں جوڑنے ان پر لکھا ایک پورا پیغام پڑھنے میں مصروف تھی۔

\*\*\*

”میں نے تو تمہیں ہائی لینڈ گرل والی نظم صرف روڈ ڈرٹھ سے متعارف کرانے کے لیے سنائی تھی۔ میں

نہیں جانتا تھا کہ اس نظم کے الفاظ میری اور تمہاری کہانی بن جائے والے ہیں۔ میں یوں یہ جگہ چھوڑ جاؤں گا اور تم پہاڑوں کی باسی لڑکی ان ہی پہاڑوں میں ایسی رہ جاؤ گی۔

زندگی ایک ایسی چیز ہے جس کے کل کے بارے میں آپ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ انسان کے ارادوں، منصوبوں اور منصوبوں کو شکست دینے میں زندگی اور وقت سے زیادہ باکمال سورما کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

خیر میں تمہارے لیے یہ پیغام اس مشکل میں اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ مجھے تمہیں پیغام دینے کا کوئی اور ذریعہ اور موقع مل نہیں رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بیڑھیوں کی رنگ سے نکلتے اس لفافے پر کسی اور کی نظر نہیں پڑے گی۔ پڑ بھی گئی تو اسے کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ ہاں۔ مگر تم ہو جس کے لیے ہر عرصہ اہم چیز بھی بہت اہم ہوتی ہے اور تم ہی ہو جو پیغام رسائی کے اس انوکھے طریقے کو سمجھ بھی جاؤ گی۔

تم نے اتنے دنوں میں جب ہم ڈاک خانے والے راستے پر پتھروں پر بیٹھے جاتیں کر رہے ہوتے تھے۔ مجھ سے کتنی ہی بار پوچھا کہ میں تمہارے لیے وہ سب کیوں کر رہا تھا جو میں نے کیا۔ میں نے ہر بار تمہیں ہنس کر ٹال دیا۔ لیکن آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ جس روز میں نے تمہیں پہلی بار تاج چاچا کے اسٹور پر کھڑے دیکھا تھا۔ اسی روز میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ مجھے کسی کو ایک اور قمر آرا بننے سے بچانا ہے۔

میں نہیں جانتا مجھے یہ خیال کیوں آیا لیکن بعد میں سوچنے پر مجھے لگا۔ تم قمر آرا کی بیٹی ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، جو کچھ قمر آرا، انہی میں کرتی رہیں اس میں بھی تمہارا کوئی قصور نہیں تھا، مگر حالات کی چکی نے قمر آرا کو کم نہیں زیادہ اس بے قصوری کی سزا میں پیسا۔ تم نے زندگی کے ہر میدان میں صرف قمر آرا کی بیٹی ہونے کی وجہ سے مار کھائی۔

میں کوئی فرشتہ نہیں تھا، سطوت سجاد جیسا کہ تم اکثر

مجھے کہتی تھیں۔ میں ایک عام اور معمولی سا انسان تھا جس کے دل میں خدا نے پہلے تو تمہاری ہمدردی کا جذبہ بچکایا اور اس کے بعد۔۔۔

”ہاں مجھے آج اعتراف کر لینا چاہیے کہ اس کے بعد۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی۔“

دنیا کا سب سے اچھا پیغام بڑھتے بڑھتے رائے اس جیلے پر آکر رک گئی تھی۔ ”گناہ۔۔۔ وہ گناہ تھا۔ جو میں نے کیا۔ اس کے دل نے کہا تھا اور پھر آگے کی عبارت پڑھی۔

”اور اپنی محبت کے لیے، اپنی محبوبہ کے لیے تو انسان کچھ بھی کرتا ہے۔۔۔ میں بھی تمہارے لیے وہ سب اسی لیے کرتا تھا۔ کالج سے نکل کر ڈاک خانے والے راستے پر جانا اور ٹھنڈیں تمہیں پہنچاتے رہتا“ اس لیے کہ مجھے یہ گوارا نہ تھا۔ تمہاری میڈم تمہیں سزا کے طور پر برآمدے میں کھڑا کر دیں اور ہر دو سزا محض تمہارا مذاق اڑاتا رہے۔

راج چاچا کے اسٹور پر ملج چاچا ایک غیر مو تمہیں باتیں سنائے یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ میں تمہیں ہریری نظر ہر بے ہودہ خیال سے بھالیتا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا تم میں اتنا اعتماد پیدا ہو جائے کہ تم دنیا میں کسی بھی طرح کے حالات اور انسان کا سامنا کر سکو۔“

میں جانتا ہوں کہ میرے اس بے اختیار جذبے اور عمل نے تمہیں بے خودی کی کیفیت عطا کر دی۔ تم۔۔۔ تمہارے حالات اور تمہارے مسائل کیا تھے۔ تم خود فراموشی کے عالم میں گروپش سے بے خبر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ لیکن مجھے اور اک تھا میں جانتا تھا کہ اس سارے کی کسی کو ذرا سی ہٹک بھی بڑ جانے پر کیا طوفان اٹھ سکتا تھا اور جو خدشہ مجھے تھا ہوا بھی دیا ہی۔

رائے۔۔۔ میری بچپن کی دوست کے ذرا سے تجسس نے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا دیا۔ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا کہ میرے گھر والوں کو جب میری سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے اس کی وجہ کس کو قرار دیا اور میں تمہیں بتاؤں گا بھی نہیں۔ میرے یوں

میں میری باتوں سے جیلے جانے سے ہی تمہیں ایک ایسی نہ ختم ہونے والی تکلیف پہنچنے والی ہے کہ میں اس کے ساتھ کوئی اور تکلیف نہ بات نہیں جو ڈنٹا چاہتا۔ کیونکہ میں نے خود پر لگنے والے اس الزام کی تردید بھی اسی لیے نہیں کی کہ اس کی وجہ سے تمہاری ذات سب کی اٹھنے والی انگلیوں سے بچ سکتی تھی اور میں تمہاری ذات اور تمہارے نام کا ہی تو محافظ بننا چاہتا تھا۔

سو میری پیاری پالی لینڈ گرل۔۔۔ محبت جس کو روز اول سے ایک جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ میں اس جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں اور اس کی باداؤں میں مجھے کالے پانی کی سزا بھی سنائی جا چکی ہے۔ میں خاموش ہوں احتجاج کرنے کے بجائے چپ چاپ اس سزا کو قبول کر چکا ہوں، کیونکہ میری چپ ٹوٹنے کی ذرا سی بے اعتدالی کے نتیجے میں کیس تمہاری ذات نشانہ نہ بننے لگے۔

میں نہیں جانتا کہ زندگی میں کبھی تمہیں دیکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ بہتر ہے نہ دیکھ پاؤں، کیونکہ میں اپنی نظروں میں تمہارے لیے صرف محبت اور احترام سمونے رکھنا جانتا ہوں۔ اب جو تم کبھی سامنے آئیں تو ان نظروں میں شرمندگی اترے گی اور یہ اٹھ بھی نہ پائیں گی۔

میری باتوں سے یہ پیغام بڑھ لینے کے بعد حقیقت سے نظر حرا لے کے بجائے اسے قبول کر لیتا۔ ایک خواب کے محور میں زندگی گزارنے کے بجائے جو حقیقت ہے اسے مان لیتا۔ تم تو میری بات آنا و صدقا کہہ کر باقی ہوئے۔ یہ بھی مان جاؤ گی، مجھے یقین ہے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تم میرا یقین ٹوٹنے نہیں دو گی۔ اور بھی دو بارہ ڈاک خانے والے راستے پر مجھے تلاش کرنے نکل نہیں جاؤ گی۔ کیونکہ ڈاک خانے کا راستہ وہم تھا اور میں صرف ایک خواب۔

\*\*\*

”میں جانتی ہوں میں سب جانتی ہوں!“ سالہ نے اپنے سامنے بیٹھی رائے سے کہا تھا۔



کمانی مرتب کرلی۔ آپ کے پاس تو پھر کوئی جواز تھا؛ میرے پاس کیا جواز تھا۔ ڈیڑی کے پھولوں کی ایک جھلک اور ایک کا اپنے معمول سے ذرا ہٹ جانا میں کون ہوتی تھی تجسس میں بڑ کر اس کا رونا توڑنے والی۔ ”وہ ٹھیک ہی مجھ سے ناراض تھا۔ وہ ٹھیک ہی مجھ سے ناراض ہے۔“

اس کا دل خلش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”میں نے اس کا محبت میں بسا دل توڑ دیا۔ دوست کبھی میرے جیسے بھی ہوتے ہیں۔ اب تو ایک کیا میں خود کو بھی معاف نہ کر سکوں گی۔“

اسے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اور سامنے بیٹھ کر کافز کے رنگ دار کپڑے میز پر جوڑے ان پر لکھے اس انوکھے پیغام کو پڑھتی صاف کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔

رائے نے ایک اواس نظر ان پر ڈالی اور پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر چل دی۔



وہ اپنے گھر کی دلیں پر نیلے رنگ کے روغن شدہ لکڑی کے پرانے دروازے کے کواڑے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ شال نے اس کے چہرے کے گرد ڈھلا بنا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں حیرت غمیر چکی تھی۔ بالائی منزل کی میڑھیاں اتر کر کوئی نیچے آ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ رائے تھی۔ ایک کی دوست جس پر اسے ہمیشہ رشک آتا تھا اور شاید عمر بھر آتا رہتا تھا۔ نہ جانے کس خیال کے تحت وہ رائے کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ کا رنگ وہ ستان تھا۔

زندگی میں انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب دلی تمام گلوں، ٹھکوں، رشک، حسد، نفرت، ناپسندیدگی جیسے احساسات سے ماورا ہو جاتا ہے۔ سلطوت پر بھی ایسا ہی وقت آچکا تھا۔ ایسا ہی وقت ہوتا ہے جب آپ کے دشمن بھی ولی بن جاتے ہیں۔ جب ہی تو اس کی مسکراہٹ کے جواب میں رائے خود سے

”میں اسی روز جان گئی تھی جس روز سلطوت کے گھر کے دروازے کی لکڑی کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ اس روز مزید جان گئی تھی جب برسوں پہلے گھر سے رات گئے استری اٹھ جانے کا عقدہ کھلا تھا اور جانتی ہو اس دن کے بعد سے آج تک میں مسلسل ایک احساس جرم میں گرفتار ہوں۔ میں نے گمان کا ارتکاب کیا۔ میں بد نظمی کا شکار ہوئی اور میں نے اپنے ہی بیٹے کو تاریفہ گناہ کی سزا دے ڈالی۔“

”میرا اپنا یہی حال ہے آئی! اور جب سے مجھے پتا چلا ہے میں ڈیڑی کے پیچھے پڑی تھی کہ مجھے آپ کے پاس لے جائیں۔ انجانے میں مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے آئی۔“ رائے بے قرار سی ہوئی۔

”سلطوت کے گھر جا کر دیکھو رائے! ایک کسان پیر اس کی تصویر روشن رکھتی ہے۔ وہ ایک کی کتابوں کو حرز چاں بنا کر رکھا ہوا ہے اس نے میں اس لڑکی کو دیکھتی ہوں اور میرا دل ایک شے میں آ جاتا ہے اس کی تو دنیا ہی وہ ہو گا جسے میں نے اس کی ماں کا شکار جان کر غیض و غضب کے عالم میں یہاں سے دور بھیج دیا۔“ صالحہ کے لہجے میں دکھ تھا اور تڑپ بھی۔

”جو میں نے پڑھا ہے آئی! کاش وہ میں اس روز سیدھیوں کی رنگ سے ابا کر نہ لے جاتی۔ کاش اس پر میری نظر نہ پڑی ہوتی تو پھر بھی شاید ان گزروے و قنوں میں سلطوت کے پاس جینے کے لیے کوئی ایسا احساس پائی رہ گیا ہو تا جو اسے زندگی جینے کا حوصلہ دے رکھتا۔“ رائے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”میرے بیٹے کے معصوم جذبات، گھرے اور بچے احساسات۔“ صالحہ نے رونے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔ ”کیسا کیسا دل نہ دکھا ہو گا اس کا جب میں نے اس پر قمر آرا کے جال میں پھنس جانے کا الزام لگایا ہو گا۔ میں نے ماں ہو کر اس کو اتنا ہلکا کیسے جان لیا کہ اسے رشتوں اور عموں کے احترام سے باقی قرار دے دیا۔“

”آپ کی آنکھوں پر قمر آرا سے بدگمانی کی پٹی چڑھی تھی آئی! آپ نے اوصوری بات سن کر پوری

پہلی بار اس کی طرف بڑھی تھی۔  
 ”آئی ایم ایکسٹریملی سوری سٹوٹ!“ اس نے  
 جھک کر سٹوٹ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ ”میں نے  
 انجانے میں تمہارا بہت بڑا نقصان کر دیا۔“ سٹوٹ  
 نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی نظروں  
 میں کب سے ٹھہری حیرت بڑھنے لگی۔

”ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ رائیڈ نے اس کی  
 حیرت بھری نظروں میں چھانکتے ہوئے کہا تھا اور مڑ کر  
 گیٹ کی طرف چل دی تھی۔  
 ”اس بے چاری نے تو میرا ایسا کچھ نہیں بگاڑا۔“

سٹوٹ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ”پھر  
 یہ کس بات کی معافی مانگ کر گئی ہے۔“ اس کی بالکل  
 بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔



پھر اس کے بعد سالہ آئی تھیں جو اسے ڈیزنی کے  
 پھول چنے پر لگا دیتیں۔ اسے ان پھولوں کے بارہ روئے  
 کو کہتیں اور فرمائش کرتیں کہ وہ ڈیزنی کے بارگھ میں  
 پن کر اور سر پر سجا کر انہیں وہی نظمیں سنائے جو اس  
 یوزوہ ڈاک خانے والے راستے پر پڑھتی سنا کر سناتی  
 تھی۔

”آپ کو بھی ورڈزور تھ پند ہے۔“ وہ ان نظموں  
 کی لائنیں سناتے ہوئے حیرت سے ان سے پوچھتی  
 تھی اور وہ جواب دینے کے بجائے اس سے سوال  
 کرتیں۔

”یہ تو بتاؤ، تمہیں اتنی مشکل انگلش اتنے صحیح تلفظ  
 کے ساتھ کس نے بولنا سکھائی۔“



چند دن بعد جب وادی میں ہمارے پورے جوین  
 پر اتر آئی تھی ظفر اور معاذ، سالہ سے ملنے آئے تھے۔  
 ”آپ کے گھر کا منظر وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا  
 آئی!“ معاذ نے دھلے کپڑے لگتی پر ڈالتی سٹوٹ کو  
 دیکھتے ہوئے سالہ سے کہا تھا۔ ”مگر افسوس کمائی کا  
 مرکزی کردار غائب ہے۔“

”مطلب یہ ہوا کہ وہ جو سننے آئے تھے کہ شک اور  
 بدگمانی، انسانی زندگیوں اور ان کی محبتوں کو یکسر بدل  
 ڈالتی ہیں، وہ بالکل درست تھا۔“ ظفر کے لیے میں  
 افسردگی تھی اور سالہ کے چہرے کی پشیمانی بڑھتی چلی  
 جا رہی تھی۔

”مجھے اور ظفر کو اس نے جانے سے پہلے ساری  
 حقیقت بتا دی تھی، لیکن آپ کو بتانے سے منع کر دیا  
 تھا۔“ معاذ نے سالہ سے کہا۔

”کیوں۔ کیوں منع کیا تھا اس نے؟“ وہ تڑپ کر  
 بولیں۔

”اسے آپ پر منح تھا۔ آپ نے اسے صفائی کا ذرا  
 سا بھی موقع دے بغیر اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ اسے آپ  
 سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس کا دل زخمی  
 ہو چکا تھا اور شاید اس گھر سے ہمیشہ کے لیے اٹھ بھی گیا  
 تھا۔“ ظفر کے دل میں اپنے دوست کی بے بسی کا دکھ بڑا  
 تھا۔

”میں نے بہت غلط کیا۔“ سالہ کہہ رہی تھیں۔  
 ”میری عمر کی بدگمانی کی جی نے اپنی گھر میری آنکھوں  
 پر ایسی سخت باندھ رکھی تھی کہ میں اسے انار سکے نہ  
 ہی اس کے بارہ دیکھ سکے۔ اپنے بیٹے کے بے مثل کردار  
 پر شک کے چھینٹے میں نے اپنی زبان سے ڈالے۔ میں  
 جس نے خود اپنے ہاتھوں اس کے کردار کی تفسیر کی  
 تھی۔“

پھر انہوں نے ان دونوں کی طرف بار بار دیکھا۔  
 ”کیا کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے میری بدگمانی پر  
 معاف کر دے۔“



”ہا! سننا ہے کہ قمر آرا کی بیٹی سٹوٹ آپ کے  
 ساتھ رہ رہی ہے اور وہ بھی ہمارے گھر میں۔“ سالہ  
 نے فون کے چونکے پر ابھری اور رنگ زیب کی آواز سنی  
 اور سامنے بیٹھی سٹوٹ کی طرف دیکھا جو سلائی مشین  
 سامنے رکھے ان کی قمیص سی رہی تھی۔  
 ”ہمارا نہیں، یہ اس کا بھی گھر ہے۔“ انہوں نے



بہت آگے آچکا ہے۔ میں ممکنہ سبب انجینئر معاذ آٹو موٹر کمپنی کے لیے ماہرین کے سامنے آئے ہو جو آٹو موٹر انڈسٹری میں کام کر رہا ہے۔ شہسی توانائی سے چلنے والی کاربنائے کی مہم میں شریک ہماری چوتھی ساھی رائیڈ گھر وال کی اندرونی سجاوٹ کا فن سیکھ چکی ہے۔ ذرا سوچو۔

اس سے آگے ظفر نے ایک ایسی شکل بنائی تھی جس کو دیکھتے ہی سنجیدہ سوچ کا خیال آتا تھا۔

”کیا یہ عمر، تعلیم اور تھوڑا بہت تجربہ بچپن میں دیکھے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں کیا ہم اب اس ادھر سے ڈھانچے کو مکمل کرنے کے لیے بہتر حیثیت میں نہیں ہیں۔ ہمارے پاس پہلے سے زیادہ علم، استطاعت اور سرمایہ ہے۔ اگر ذرا سوچنے کے بعد میری بات دل کو گتے تو میں ہمساری واپسی کی تاریخ کی اطلاع کا شکر رہوں گا۔“

اس نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے ظفر کی میل سے نظر ہٹائی اور اپنے فون پر بھیجی اس کل کی کھنٹی کی طرف متوجہ ہوا جو اس ایک کے ذریعے اسے کی جا رہی تھی۔ اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف اس کے بچپن کا دوسرا دوست معاذ تھا۔

”میں پچھلے دنوں کھر گیا تو صالحہ آٹنی سے بھی ملنے چلا گیا۔“ وہ گم رہا تھا۔ ”یار! میں تو انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کتنی بوڑھی، کمزور اور تھابو چکی ہیں۔“

ایک کے دل نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

”اور تک زیب بھائی نے کراچی چلے جانے کے بعد پلٹ کر ان کی خبر تک نہیں لی۔ یار! میں اپنے بچوں کو پال پوس کر اس لیے تو بڑا نہیں کرتیں کہ وہ انہیں تھابو چھوڑ کر روہیں جا بیس۔“

اس کا دل بھر آنے لگا۔

”میں جانتا ہوں ایک! تمہیں صالحہ آٹنی پر رنج ہے۔ دل میں گلہ بھی ہو گا، شکایتیں بھی ہوں گی، مگر میرے دوست، ماؤں سے کہیے گلے اور کہاں کی شکایتیں، بڑے ہو نے پر کہیں بھی چلے جاؤ، کچھ بھی بن جاؤ، پوری دنیا میں ایک ہی تو دل ہوتا ہے جو ہمارے

پر سکون لہجے میں جواب دیا ”اور ہاں قمر آرا نہیں چچی قمر آرا کہا کرو۔ وہ تمہاری عمر کی تو نہیں تھی جو ایسے بے ججک نام لیتے ہو۔“

”وام۔ آپ تو بہت مہمان ہو گئیں، چلی منزل والوں پر۔“ اور تک زیب کے لہجے میں مسخر جھلکا۔

”خیر، پھر وہ اصل بات پر آتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو آپ اس لڑکی سے بات کر کے وہ کھرچ سکتی ہیں نا!“ وہ قریب کھڑی مریم کو ایک آنکھ دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ یہ کھر بے گا“ کہے گا نہیں۔“ اور تک زیب کی ماں نے اسے اس سے پہلے اتنا حیران کبھی نہیں کیا تھا۔

\*\*\*

”ہم نے بچپن میں ایک ساتھ ایک خواب دیکھا تھا، ہمارا لڑکپن اس خواب کو تعبیر میں ڈھالنے کے لیے دسان کل جمع کرتے کزرا اور ہماری جوالی کا آغاز اس کی تعبیر پر کام کرنے سے ہوا، خواب سچا ثابت ہو سکتا تھا۔ تعبیر میں ڈھل سکتا تھا، لیکن اس سے پہلے ہی ہم ادھر ادھر بکھر گئے۔ خواب کا ڈھانچہ وہیں میرے کھر کے گیراج میں بڑا رہ گیا۔“

ایک ظفر کی ای میل پڑھ رہا تھا۔

”سمجھ تو تم گئے ہو گے۔“ ہاں وہی گاڑی جسے مکمل کرنے کے بعد ہم شہسی توانائی کے ذریعے چلائے والے تھے۔“

ایک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑی۔

”کمزورے کل پر نظر ڈالو تو ہنسی آتی ہے۔ دو عدد کنٹینر لڑ، چار جائزہ اسکوپ ایک کمپیوٹر اگلوں ختم۔ بابا۔ ہمارا فارمولا اور تکنیک ایک چھوٹا موٹا مونیٹریک تو بنا سکتی تھی۔ مگر میرے ابا کی پرانی گاڑی کو شہسی توانائی سے چلنے کے قابل کہاں بنا سکتی تھی۔“

وہ بڑھتے بڑھتے رک کر ہنسا۔

”مگر کل کمزور چکا۔“ اگلی لائن سکول کرنے پر لپ ٹاپ اسکرین پر روشن ہوئی۔ ”اور ہم سب اب آج میں موجود ہیں۔ ہم چاروں کا آج جو کمزورے کل سے

# دکن

دسمبر 2016 کا شمارہ شائع ہو گیا

ادبی شاعری کے ساتھ دکن کے شاعر

”شعیر الکوا خاتم الانبیاء علیہ السلام“

دکن کے شاعر کے ساتھ دکن کے شاعر

- اداکارہ ”گوہر ممتاز“ سے شادی کی ملاقات،
- ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ بہانہ میں ”مرزا ہالیوں“
- اداکارہ ”ایمن خان“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“
- اس ماہ ”کنیز قاطرہ“ کے ”مقابل ہے آئینہ“
- ”من مور کھ کی بات نہ مانو“ آسیہ مرزا کا
- سلسلے وار ناول،
- ”راہنزل“ تنزیہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- ”گل گھسار“ فرح بخاری کا مکمل ناول،
- ”دل تیری اسیری کا بہانہ ڈھونڈے“
- صدف آصف کا مکمل ناول،
- ”عشق والا“ ساس گل کا دلچسپ ناول،
- ”سچائی کی منزل“ میہ راشد کا دلچسپ ناول،
- ”بخت جاگ اٹھے“ حیرانوشین کا ناول،
- ”اُمید صبح بہار رکھنا“ شہناز شکر کا ناول،
- ”ظہیر قاطرہ“ صاعداقبال اور کنیز قاطرہ کے افسانے

اور مستقل سلسلے

لیے بے لوث اور بے خلوص دماغیں کرتا نہیں تھکتا  
اور وہ ہماری ماؤں کا دل ہوتا ہے یا۔ ماؤں سے  
ناراض ہو کر خود سکون سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ بھی  
تمہارے جیسے بیٹے۔“  
معاذ کہہ رہا تھا اور ایک سن رہا تھا۔ اس کے وجود  
کے اندر ہی کہیں اس کے آنسو بھر رہے تھے۔

\*\*\*

سوکھی سرخ ثابت مرچیں بر آبدے میں نیچے  
کپڑے پر بکھری تھیں اور وہ فرش پر بیٹھی ان کی خشک  
ڈنڈیاں توڑ رہی تھی۔ یوں ہی کام میں مگن اپنے خیالوں  
میں مگن اس نے پل بھر کو سر اٹھا کر دیکھا تھا اور اس کی  
نظریں نیچے خلائی میں ساکت رہ گئی تھیں۔  
”اور جو صالحہ آئی کو کبھی پتا چل جائے کہ میں ان  
کے بیٹے کے حرم میں اتنی بری طرح گرفتار ہوں کہ دن  
کے بچہ نہیں گھنٹوں میں کوئی دس ایک بار تو مجھے اپنے  
سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور پھر میں اس التباس کو کتنی ہی  
چلی جاتی ہوں تو وہ کیا سوچیں گی۔ انہیں کتنا برا لگے  
گا۔“ اس نے سوچا تھا۔ ”جب ہی تو وہ مجھے ٹوکتی رہتی  
ہیں کہ تم گھنٹوں بیٹھی خلا میں کیا دیکھتی رہتی ہو۔“  
مرچیں اس کی گرفت سے نکل کر واپس کپڑے پر  
جالو تھکیں۔ اس نے سر جھٹک کر دھیان ہٹانا چاہا۔  
لیکن اس کا التباس ضدی تھا اور اتنا زور آور کہ نظروں  
کے سامنے سے ہٹنے کے بجائے تیز قدموں سے اسی کی  
طرف چل رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ اس کے سر  
کی طرف جھٹک گیا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔  
”کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ میں تمہیں خواب میں  
نہ دیکھوں۔“ وہ اس پر جھکا کہہ رہا تھا۔ ”مگر یہ کیا  
خواب ہے“ انوکھا اور ناقابل یقین۔ تم میرے گھر میں  
یوں بیٹھی ہو جیسے یہ تمہاری ہی تو ملکیت ہو۔“ وہ اس پر  
جھکا جیسے خود فراموشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔  
”بھاگ جاؤ ہائی لینڈ گرل بھاگ جاؤ یہاں سے“  
کیونکہ اگر تم یوں ہی خواب بنی یہاں بیٹھی رہیں تو میں  
یہاں رک نہ پاؤں گا۔ بھاگ جاؤ پلیز۔ نیچے میری ماں



”ہاں تمہیں نہیں بتایا۔“ وہ لاپرواہی سے پولیس۔  
 ”میں نے سوچا مہذب شہروں سے دور۔ اس غیر ترقی  
 یافتہ دور افتادہ بستی میں ہونے والی ایک معمولی سی  
 بدلتی شادی میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو کہاں  
 دلچسپی ہوگی۔ میں بتاؤں، تم دلچسپی نہ لو، میں بلاؤں تم  
 شادی میں شرکت کرنے نہ آؤ تو میرا دل بہت برا  
 ہو جائے گا۔ اسی لیے نہیں بتایا۔“

وہ صاف گوئی سے پولیس اور ترقی یافتہ مہذب شہر  
 میں بیٹھے پھانسل کے باسی اور رنگ زیب کا دل چاہا اسی  
 وقت سب پابندیاں توڑ کر واپس اس بستی میں پہنچ  
 جائے جہاں سرمایہ برف گرئی تھی اور جہاں میں ڈیزل  
 کے پھول اگتے تھے۔



”کیسی کیسی طویل بحثیں کیا کرتے تھے ہم سب  
 مجھ سے روٹنا ہونے کے بارے میں۔“ معاذ نے  
 گاڑی کے پیسوں پر نئے دھیل کپ چڑھاتے ہوئے کہا  
 تھا۔

”یاد ہے۔“ گاڑی کے فٹلے حصے میں مرمت کا  
 کوئی کام کرتے ایک نے جواب دیا تھا۔ ”تاریک  
 راتوں میں شمعیں روشن کر کے روجوں کو بلاتے تھے  
 اور ان سے پوچھتے تھے کہ اگر مجھ سے روٹنا ہوتے ہیں تو  
 کیا ابھی ہماری گاڑی بھی بن جائے گی۔“ وہ ایسے لپٹے  
 باہر کو کھسکا اور اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر  
 گریس کے داغ لگ چکے تھے۔

”بیٹا! اگر سطوت کے ساتھ تمہاری شادی ہو جائے  
 کا مجھ سے روٹنا ہو سکتا ہے تو پھر اس گاڑی کا بیٹا اور چلنا  
 کون سا مشکل کام ہے۔“

ظفر نے منہ میں دیا پیچ کس نکال کر ٹول پکس میں  
 رکھتے ہوئے کہا اور رائیہ کے قریب کھڑی سطوت کی  
 طرف دیکھا۔ جس کے ہاتھوں پر حنائی پھول سجے تھے  
 اور سر پر کرن لگا گلابی دوپٹا تھا۔

”یاد کرو وہ دن جب میٹروں کی ریٹنگ کے ساتھ  
 دنیا کے انوکھے ترین پیغام کو پتنگ کی ڈور سے باندھ کر

کی خاطر یہاں رہنا نہایت میں دل کے سب شکوکے  
 بھلا کر دور دس سے چلتا ان ہی کے لیے تو یہاں آیا  
 ہوں۔“

سطوت نے نظر جراتے ہوئے اوپر دیکھا۔ وہ اب  
 تک اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس بار شاید وہ التباس  
 جن دن کر اسے چھٹنے کو آیا تھا۔

”ڈیڑیاں توڑ لیں سطوت!“ سامنے والے کمرے  
 سے صالحہ کی آواز سنائی دی۔ ”ٹوٹ گئی ہیں تو یہ کپڑے  
 اور مجھے اس میں باندھ دو۔ کپڑی سے ملازم آتا ہے تو  
 چکی پر پیچ کر پھینک دیں گے۔“

وہ اپنے دھیان میں بولتی، کمرے کا جالی وارد راہ  
 کھول کر باہر نکلی تھیں اور نظر اٹھا کر دیکھنے پر سہکت  
 ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف  
 دیکھتے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر سہکت وجود تھے۔



”سنا ہے آپ ایک کی شادی چچی قبر آرا کی بیٹی  
 سطوت سے کر رہی ہیں۔“ اورنگ زیب فون کا چونکا  
 کان سے لگائے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آواز میں بے یقینی  
 تھی۔

”ہاں ٹھیک سنا تم نے۔“ صالحہ نے شادی کے کارڈ  
 سے بندھی سرخ اور سنہری ڈوری کتے ہوئے جواب  
 دیا اور اپنے کان اور کندھے کے درمیان دیار بیسور نکال  
 کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”اب شادی کے کاموں کے لیے تو میں نے وضو ان  
 کو خاص طور سے بلا کر گھر ہی میں رکھ لیا ہے، تاکہ میرا  
 کام بھی ہوتا رہے اور تمہیں پل پل کی خبر بھی پہنچتی  
 رہے اور کسی کو یہاں اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ  
 تمہیں یہاں کی تفصیلات بتا سکے۔“

”ایک واپس آلیا۔ دنیا کی سب سے ناممکن شادی  
 طے ہو گئی، کارڈ تک چھپ گئے اور مجھے آپ نے بتانا  
 تک گوارا نہ کیا۔“ اورنگ زیب جواب تک یقین اور  
 بے یقینی کی کیفیت میں جھٹکا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر  
 کھڑا ہو گیا۔

بچوں کے ہاتھوں سے چھوڑے رنگ برنگ غبارے  
غبارے فضا میں بلند ہوئے۔ شمس توانائی سے چلائی  
جانے والی گاڑی کا پسلا تجربہ کامیاب رہا تھا اور ان  
چاروں کا پرانا خواب حقیقت میں ڈھل کر سب کے  
سامنے آچکا تھا۔



”محبت اگر ایک جزیرہ ہے تو میں اپنی پوری عمر اس  
جزیرے میں گزارنے کو تیار ہوں۔“ ایک نے ڈاک  
خانے والے راستے کی طرف مڑتے ہوئے کہا تھا۔  
”اور محبت اگر ایک خواب ہے تو میں تا عمر آنکھیں  
موندے یہ خواب دیکھنے کو تیار ہوں۔“ ایک کے  
ساتھ چلتی سطوت مسکرا کر بولی تھی۔ اس کی آواز میں  
اور اس کی چال میں جو اعتماد اور سوز تھا وہ ڈاک خانے  
کی طرف جانے والے راستے نے پہلے بھی نہیں دیکھا  
تھا۔

”میری سوٹ ہائی لینڈ گرل! شاید میں اس خواب  
جزیرے میں جس کا نام محبت ہے میں رہنے کے لیے  
ہی تو واپس لوٹ آیا ہوں۔“ ایک نے پیار سے  
سطوت کی ناک کو چھوتے ہوئے کہا اور پھر اپنی نظروں  
کے سامنے اوپر جاتے راستے کو دیکھنے لگا۔  
”چلو اپنے اپنے خواب جزیرے کی طرف جانے  
والے راستے کو ڈیڑی کے پھولوں سے آبی ہنسی کی  
آوازوں سے اور تمہاری آنکھوں میں جلتی خوشی اور  
سکون کی جوت سے سجاتے ہیں۔“  
اس نے سطوت کا ہاتھ تھما اور وہ اپنی محبت کے  
رازدار اس راستے پر چل دیے جہاں کوئی دوسرا کم ہی  
جاتا نظر آتا تھا۔



فرار ہوئے تھے تمہ۔“ رائے نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر  
اس روز میں کانگریز کی وہ کمر نہیں اپنے ساتھ نہ لے جاتی  
اور وہ سطوت کے ہاتھ لگ جاتا تو کیا معلوم سطوت تم  
سے مایوس ہو کر اپنے ماموں کے پاس ہی جا چکی ہوتی۔  
کیوں سطوت؟“

اس نے سطوت کی طرف دیکھا جو اس کی بات سن  
کر مسکرا رہی تھی اور مسکراتے ہوئے ایک کی طرف  
دیکھ رہی تھی اور ایک نے بھی اسی لمحہ اس کی طرف  
دیکھا تھا۔ سطوت کی بھوری مائل سنہری آنکھوں سے  
سورج کی کرنیں ٹکرا رہی تھیں اور سورج کی ان کرنوں  
سے منعکس ہو کر وہ اور بھی سنہری نظر آنے لگی  
تھیں۔

”ہاں یہ معجزہ ہی تو ہے۔“ دونوں کی نظریں ایک  
دوسرے سے کمر رہی تھیں۔



”Here We Go“

فضا میں معاذ کی بلند آواز گونجی تھی اور ایک منظر  
سے ہجوم کی شکل میں کھڑے لوگوں کی تمام تر توجہ معاذ  
کی آواز کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس ہجوم میں  
بچے، بڑے اور بوڑھے سب شامل تھے معاذ، ایک  
رائے اور ظفر کے گھر والوں سمیت ان کے اسکول کالج  
کے اساتذہ اس چھوٹی سی بستی کے اکثر مکین اس  
علاقے سے نئی نئی نشریات شروع کرنے والے ایف  
ایم ریڈیو کا عملہ چند نئی ٹی وی چینلوں کے نمائندے  
اور علاقے کے عوامی نمائندے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر معاذ تھا اور ایک اس کے ساتھ  
فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ظفر اور رائے گاڑی کی کھلی  
پھت سے سربراہر نکالے کھڑے تھے۔ ایک جھٹکے سے  
گاڑی اشارت ہوئی اور ایک زوردار آواز نکالتے  
ہوئے اس چھوٹے سے میدان کے اندر چکر لگانے  
لگی۔ ہجوم سے تالیوں اور سینوں کی آواز بلند ہوئی اور